DATE LABEL

DATE LABEL

خطباتِ مُشران

بزمِ اول

یعنی

آنجہانی پنڈت سندر نراین مشران

رئیس فرخ آباد کے چند خطبے

مع مقدمہ

از شاعرِ حریت جناب نسیمؔ امروہوی

مشمولہ

نصاب "بی۔ اے۔ آنرز" لکھنؤ یونیورسٹی

قیمت ۱۲؍

22207

فہرست مضامین

DATE LABEL

"شہیدِ ادب"

پنڈت سُندر نراین صاحب مُشران

کے

مختصر حالات زندگی

پنڈت سندر نراین مُشران ایم، آر، اے، ایس (لندن) فرخ آباد کے رئیس اور اُردو کے نامور خطیب اور ممتاز ادیب تھے - آپ کے والد پنڈت لچھمی نراین مُشران پسندیدہ خدمات کے صلے میں ملکہ وکٹوریہ کی سندِ خیر خواہی پائے ہوئے تھے اور آپ کے دادا پنڈت گوردھن داس مُشران کو (جو نواب تجمل حسین خاں بہادر، والی فرخ آباد کی سرکار میں مدارالمہام تھے) بہادر شاہ بادشاہ دہلی کی سرکار سے "انتظام الدولہ، ممتاز الملک، مہاراجا گوردھن داس بہادر، دیوان اعلیٰ" کا خطاب تھا - اُن کی اسناد میں تحریر ہے کہ فرخ آباد کے ضلع کا انتظام مالی، بعد غدر محض گوردھن داس کے مشورے سے کیا گیا ہے - پنڈت گوردھن داس کے بزرگ صوبہ دار کشمیر تھے لیکن کشمیر کی طوائف الملوکی کے زمانے میں ترک وطن کر کے فرخ آباد میں اقامت گزیں ہو گئے تھے -

شہیدِ ادب کو رفاہِ عام کے کاموں سے ہمیشہ خاص دلچسپی رہی - ۱۸۹۹ء میں آپ کی کوشش سے فرخ آباد میں ایک پبلک لائبریری قائم ہوئی - جس کی ترقی و بقا کے تمام سامان آپ نے اپنی حیات ہی میں فراہم کر دیے - جب یہ لائبریری اپنے وجود کی تینتیس ۳۳ منزلیں طے کر چکی تو بتاریخ ۳۱ رجولائی ۱۹۳۲ء لائبریری ہال میں ایک سنگ مرمر کی لوح آپ کی یادگار میں نصب کی گئی اور جلسۂ عام میں ایک سپاسنامہ اعتراف امتنان کے طور پر ممبران لائبریری کی طرف سے آپ کی خدمت میں پیش کیا گیا - جس میں آپ کی لیاقت علمی، شرافت، بے تعصبی اور ہر دلعزیزی کا ذکر

کرتے ہوئے حسب ذیل الفاظ میں آپ کی پبلک خدمات کا اظہار کیا گیا:-

"آپ نے جو خدمات، بحیثیت آنریری منصف و مجسٹریٹ انجام دیں، وہ جمہور کے نزدیک بہت قدر کے لائق سمجھی گئیں - جس آزادی اور معدلت گستری سے آپ نے یہ خدمتیں انجام دیں، اس کی نظیر اس شہر میں کمتر ملتی ہے اور پھر جس استغناء سے آپ نے دونوں عہدوں سے دست کشی کی، وہ اس شہر کی تاریخ میں یادگار رہے گی۔ ان عہدوں کو حاصل کرنے کے لئے لوگ ہمیشہ آرزومند رہتے ہیں، لیکن آپ نے ان عہدوں کو ایسی بے پرواہی سے چھوڑا، گویا آپ ان کی طرف سے بالکل مستغنی و بے نیاز تھے - صحیح یہ ہے کہ آپ نے ان عہدوں کو خود تلاش نہیں کیا، بلکہ ان عہدوں نے خود آپ کو ڈھونڈھا تھا - یعنی حکام نے آپ کی لیاقتوں اور کارگزاریوں کے صلے میں آپ کو یہ عہدے عطا فرمائے تھے کہ عامۂ رعایا کے حق میں، آپ باعث رحمت اور موجب برکت ثابت ہوں - جب اس شہر میں سنہ ۱۹۲۱ء میں پنچایت کمیٹیاں قائم ہوئیں، تو ایک عظیم الشان جلسے میں ہندوؤں مسلمانوں نے آپ کو سرپنچ انتخاب کیا اور اس صیغے میں بھی آپ کی خدمتیں قابل تحسین سمجھی گئیں۔ آپ نے جس آزادی اور رحمدلی سے سنٹرل جیل کی انسپکٹری کی وہ اہل زنداں کو ہمیشہ یاد رہے گی - ہمارے شہر کے اکثر بڑے آدمی اس عہدے پر مقرر ہوئے مگر کسی نے بیچارے قیدیوں کے حال زار پر کوئی توجہ مبذول نہ کی - آپ نے ہمیشہ رپورٹیں لکھیں، جن میں آپ نے اہل زنداں کی غذا، آرام و آسائش، سیر و تفریح کے واسطے وقتاً فوقتاً سفارشیں کیں - پولیٹیکل قیدیوں کو خاندان کے عزیزوں سے خط و کتابت کرنے کی اجازت دلوائی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اہل زنداں عموماً اور پولیٹیکل قیدی خصوصاً، آپ کو اپنے حق میں بخشندۂ برکات سمجھتے رہے - پانچ برس سے آپ نے جو شاندار خدمتیں بطور 'میر مجلس ہندو مسلم اتحاد بورڈ' کے انجام دیں، وہ حکام عالی مقام سے پوشیدہ نہیں ہیں اور شہر فتحگڑھ، بلکہ تمام ضلع کے ہندو مسلمان ان سے بخوبی واقف ہیں - آپ کی صدارت میں پانچ سال سے اس شہر میں نہایت امن و اماں رہی ہے اور سب ہندو مسلم تیوہار،

بہ تزک واحتشام اور بحسن وخوبی تمام، انجام پا رہے ہیں، جس کی وجہ سب سے بڑی یہ ہے کہ ہمارے اتحاد بورڈ کے میرمجلس، یعنی آپ، ایسے شخص ہیں جو تعصبات مذہبی سے محض ناآشنا اور فسادات قومی کے دشمن ہیں۔ بورڈ کا کام اور انتظام اس حسنِ اخلاق اور حسنِ تدبیر سے ہوتا رہا ہے کہ پانچ برس میں کبھی ووٹ لینے کی ضرورت نہیں ہوئی۔ گویا سب کام بہ اتفاق تمام انجام پاتے رہے۔ آپ کی سفارش پر آٹھ یا نو ہندو مسلم ارکان بورڈ کی خدمتوں کی قدردانی منجانب حکام ضلع، دو مرتبہ کی گئی اور خوشنودی مزاج کی سندیں عطا ہوئیں"

شہیدِ ادب نے جنگ عظیم کے دوران میں بحیثیت سکریٹری لائبریری، چار برس تک، بطور "وار لکچرر" کے گورنمنٹ اور رعایا کی خدمت بخوبی تمام اور بخوش اسلوبی بالاکلام انجام دی اور ان عظیم الشان جلسوں میں، جو مجسٹریٹ ضلع کی صدارت میں منعقد ہوئے، آپ نے وہ فصیح و بلیغ پولیٹیکل تقریریں فرمائیں جو آپ کا علمی کارنامہ سمجھی جاتی ہیں۔ یہ پولیٹیکل لکچر (جو بعنوان "جنگ عظیم" شائع ہو چکے ہیں) گورنمنٹ اور رعایا کے حق میں رحمت و برکت ثابت ہوئے اور رعایا اور سرکار کے باہم خیرخواہی اور ہمدردی کے تعلقات میں بہت اضافہ ہوگیا۔ جدید حالات میں بھی وہ ہماری رہنمائی کے لیے کافی ہیں، کیونکہ ان کے مطالعے کے بعد ہر شخص اسی نتیجے پر پہونچتا ہے کہ موجودہ عالمگیر جنگ میں بھی اتحادی طاقتیں آخرکار اپنے زبردست اخلاقی وسائل کی بنا پر کامیاب ہوں گی۔

آپ کے خطبات کا مجموعہ موسومہ "خطبات مشران" ایک رنگارنگ پھولوں کا گلدستہ ہے جس میں آپ نے اخلاقی، علمی، سیاسی اور تمدنی ہر قسم کے مباحث پر سلیس اور دلچسپ الفاظ میں روشنی ڈالی ہے۔ آپ کی تقریریں بہت صاف اور سلجھی ہوئی اور طرزِ ادا نہایت دلکش ہے۔ زبان وہی ہے جو فصحائے دہلی و لکھنؤ بولتے ہیں، جس کے بارے میں آپ نے خود ایک خطبے کے دوران میں ارشاد فرمایا ہے "اردو میں نے پیرزالان کشمیر (اپنی ماں۔ بہن وغیرہ) سے سیکھی ہے" حق یہ ہے

کہ ایسی فصاحت اور بلاغت جیسی کہ آپ، کے خطبات میں ہے، اُسی کو حاصل ہو سکتی ہے جس نے اپنی ماں، بہن کی گود میں زبان سیکھی ہو۔

"خطباتِ مشران" کے مختلف منتخب خطبے، آگرہ یونیورسٹی کے ایم، اے۔ لکھنؤ یونیورسٹی کے بی، اے آنرز اور جامعہ اُردو آگرہ کے امتحانات ادیبِ ماہر، و ادیبِ کامل، کے نصابات میں شامل کیے گئے ہیں۔ اور یہ کتاب صوبۂ متحدہ اور ریاست ہائے حیدرآباد و کشمیر کی تمام درسگاہوں کے کتب خانوں کے لیے منظور ہو چکی ہے۔

علم و ادب سے آپ کو جو روحانی تعلق تھا اُس کے اظہار میں یہ واقعہ خصوصیت سے بیان کرنے کے قابل ہے کہ ۱۰ر جنوری ۱۹۳۷ء کو ستّتر برس کی عمر میں فرخ آباد کے ایک عظیم الشان مشاعرے میں بحیثیت صدر افتتاحی تقریر کرتے ہوئے آپ جاں بحق ہوئے اور قوم سے "شہیدِ ادب" کا خطاب پایا ؎

ایسی مرگِ کامراں ملتی ہے کس انسان کو
زندۂ جاوید کہنا چاہیے مُشران کو



"شہید ادب"
آنجہانی پنڈت سندر نراین مشران
رئیس فرخ آباد

درخت ہوں کہ دھوپ اور ہوا کو روکیں بس جوان ہونے کے بعد وہ خود سب سامان اپنی مہمانی اور خوراک کا کر لیتا ہے۔ پانی زمین سے جذب کرتا ہے اوسکی جڑیں زمین کی مٹی کو پکڑ لیتی ہیں۔ ہوا اور دھوپ وہ خود لیتا اور جذب کرتا ہے اسکے سوا اوسکی ہمت اور استقلال کو بھی دیکھنا چاہئے جسنے سالہا کی دھوپ اور ساون بھادوں کا مینہ اور جاڑے کی سردی اور برف اور اولے اور طوفان ہوا اور زمین کے زلزلے اور بادل کی گرج اور بجلی کی آگ سب برداشت کرتا ہے اور جب اوسمیں میوہ لگتا ہے تب وہ ہمارے پتھر اور بانس کھاتا ہے لوگ اوسکے پھل پھول چھال لکڑی پتے لیتے ہیں وہ دوست اور دشمن دونوں کی خاطر تواضع کرتا ہے اور بے انتہا فائدہ پہونچاتا ہے اور جب وہ مرجاتا ہے (یعنی سوکھ جاتا ہے) تب بھی جلانے کی لکڑی

عکسِ تحریرِ شہیدِ ادب

مقدمہ

از

شاعرِ حرّیت حضرت نسیم امروہوی

مقدمہ

از شاعرِ حُرّیت حضرت نسیم امروہوی

پنڈت سُندر نراین بُھشران مرحوم کے خطبات پر مقدمے کی حیثیت سے کچھ لکھنا کس قدر مشکل ہے، اس کا اندازہ صرف وہی شخص کر سکتا ہے، جس کی طبع رسا، ان بلند پایہ خطبات کی علمی اور ادبی گہرائیوں کو سمجھنے کی اہلیت رکھتی ہے۔ یہ خطبات، جو معاشرت، ادب، تاریخ، سیاست اور علم و حکمت کے مختلف اور بیشتر شعبوں پر حاوی ہیں، اپنے تعارف و تبصرہ کے لیے ایک فکر نکتہ رس اور طبع نقاد کے محتاج ہیں۔ مشہور ہے کہ جب گبن نے اپنی مشہور تاریخ "عروج و زوال روما" لکھ کر ختم کی تو اس نے جوشِ مسرت میں مفتخرانہ انداز سے کہا تھا:— "میں اپنی کتاب کے لیے مقدمہ نویس کہاں سے لاؤں" —— گبن نے ان چند لفظوں میں یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی تھی کہ میری تصنیف جس پایے کی ہے، اس کے شایان شان مقدمہ لکھنے والا، صفحۂ ارض پر کوئی موجود نہیں — ممکن ہے کہ گبن کو اپنی تاریخ کے لیے کوئی ایسا مقدمہ نویس مل جاتا جو اس کے محققانہ معیارِ انتخاب پر پورا اُترتا، لیکن جہاں تک خطباتِ بُھشران کی بلند پایگی اور ادبی قدر و قیمت کا تعلق ہے، یہ بات آسانی سے کہی جا سکتی ہے کہ وہ قلم جو کہ ان خطبات کی حقیقی اہمیت کو واضح کر سکے، کم سے کم اس شخص کے پاس نہیں ہے، جو اس وقت اس سلسلے میں خامہ فرسائی کی ناکام کوشش کر رہا ہے۔ یہ صرف شاعری ہی نہیں بلکہ حقیقت ہے کہ "خطباتِ بُھشران" پر کچھ لکھنا آسان نہیں۔ ان خطبوں میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ ایک نظرِ غائر اور فکر جامع کا محتاج ہے۔ اوّل تو ادبیات میں "خطبہ" یوں ہی ایک مشکل ترین اور جامع ترین صنف ہے اور پھر اس صنف ادب کی خصوصیات کو علمی اصول پر بیان کرنا اور ان کی تمام وسعتوں کو چند سطروں میں

سمیٹ کر کسی خطیب کے خطبوں کی ادبی اور علمی خوبیوں پر روشنی ڈالنا اس قدر دشوار اور جامعیت طلب ہے جس کی حد و انتہا نہیں -

پنڈت جی کے خطبات علم و ادب، تاریخ و سیاست، تمدن و معاشرت اور نفسیات کے بے شمار اور اہم ترین مسائل پر مشتمل ہیں، جن سے اس مجموعے میں ایک مستقل علمی تصنیف کی شان پیدا ہو گئی ہے - موصوف نے جس موضوع کو بھی لیا ہے، اس کی جزئی تفصیلات تک بیان کر دی ہیں - درحقیقت ان کا ہر خطبہ بجائے خود ایک معنی خیز مقالہ ہے - فرق صرف اتنا ہے کہ ایک مقالہ نگار اپنے خیالات کو پہلے قلمبند کر لیتا ہے پھر منظرِ عام پر لاتا ہے - برخلاف اس کے ایک خطیب اپنے دلائل کو زبانی بیان کرتا ہے اور ادائے مافی الضمیر میں زبان قلم کی ترجمانی کا محتاج نہیں ہوتا - مقالہ نگار اظہار خیالات کے وقت آزاد ہوتا ہے - وہ ایک فقرہ لکھ کر ہزار بار مٹا سکتا ہے اور دس ہزار بار بنا سکتا ہے لیکن ایک خطیب کو یہ سہولتیں میسر نہیں ہوتیں - وہ عوام کے مجمع میں گھرا ہوتا ہے - اس کے پاس اظہار و بیان کے لیے محدود وقت اور محدود گنجائش ہوتی ہے - اُسے اپنے دل، دماغ اور زبان تینوں اعضاء سے بیک وقت کام لینا پڑتا ہے - اس کے پاس سوچنے کو وقت نہیں ہوتا اور نہ اثنائے تقریر میں اپنی یادداشت کو تازہ کر سکتا ہے - ظاہر ہے کہ ان حالات میں خطبے کی علمی شان قائم و برقرار رکھنا کس قدر مشکل ہے -

زیر نظر خطبات وہ تقاریر ہیں جو پنڈت جی نے مختلف سیاسی، ادبی اور معاشرتی مجلسوں میں ارشاد فرمائیں اور اسی وقت ان کے کاتب خاص نے قلمبند کر لیں - وہ تقریر کرتے جاتے تھے اور کاتب لکھتا جاتا تھا - ایسا اتفاق بہت کم ہوا ہے کہ موصوف نے ان پر نظر ثانی کی زحمت گوارا فرمائی ہو - کل مجموعے میں صرف تین خطبے ایسے ہیں جو پہلے سے لکھے گئے تھے اور پنڈت جی نے جلسوں میں انھیں پڑھ کر سنایا تھا - یہ تینوں خطبات گزشتہ جنگ عظیم کے حوادث سے تعلق رکھتے ہیں اور چونکہ وہ سرتاسر تاریخی موضوعات تھے، متعدد ممالک کی جغرافیائی بری اور بحری

پوزیشن سے بحث کرنا ان کے لیے ناگزیر تھا اور مُلکی نظم و نسق کے اندرونی اسرار کا انکشاف بھی ضروری تھا، اس لیے محض تقریر کے دامن میں ان کا سمانا امکان کے حدود سے باہر تھا۔ ان خطبات کے علاوہ بقیہ تمام خطبے وہ ہیں جو اظہار و بیان سے قبل قیدِ تحریر میں نہیں آئے۔ اور اُس وقت لکھے گئے جبکہ وہ کسی جلسے میں ادا ہو رہے تھے۔

خارج از موضوع نہ ہوگا اگر اس موقع پر صنف خطبہ و تقریر کے متعلق منطقیانہ زاویۂ نگاہ سے کچھ بیان کر دیا جائے، جس کے بعد ان خطبات کی اہمیت واضح ہونے کے مزید امکانات پیدا ہو جائیں گے۔ خطبہ کیا ہے۔؟ وہ تقریر جو کسی جلسے میں کی جائے۔ اس بیان کے مطابق فن تقریر و خطابت میں بظاہر کوئی اصولی فرق باقی نہیں رہتا مگر نظر غائر سے دیکھا جائے تو ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔ تقریر اس بیان کو کہتے ہیں جو کسی جلسے یا صحبت میں کسی بھی موضوع یا مسئلے پر ارادۃً دیا گیا ہو مگر خطبہ صرف وہی بیان ہے جو علمی مسائل کی تحقیق و تشریح کے لیے یا کسی موضوع کو عالمانہ لہجے اور انداز بیان میں سامعین کے ذہن نشین کرنے کے لیے کسی منبر یا پلیٹ فارم سے دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ تقریر میں یہ حد بندی نہیں ہوتی۔ گویا خطبہ و تقریر میں عموم و خصوص مطلق کی نسبت ہے۔ اسی بات کو زیادہ واضح لفظوں میں یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ صرف علمی تقاریر کو ہی خطبات کہا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دُنیا میں مُقرّر ہزاروں لاکھوں ہوتے ہیں مگر ان بے شمار مُقرّروں میں خطیب اُنگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ مُقرّر اور خطیب میں وہی فرق ہے جو ایک مُصنّف اور محقق میں ہوتا ہے۔ اگرچہ محقق بھی اپنی تحقیقات کی تصنیف و تالیف کے اعتبار سے مُصنّف کہلاتا ہے مگر اس کا درجہ محض مصنّف سے بالاتر ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک خطیب بھی ایک مُقرّر سے اعلیٰ شخصیت کا مالک ہے۔

خطبے کی تعریف کے بعد سرسری طور سے یہ لکھ دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کی اصل و ابتدا کہاں سے ہوئی۔ درحقیقت خطبہ اُس عہد کی پیداوار ہے جب دنیا میں کتابوں کا رواج عام نہ تھا۔ اس لیے اُس عہد کے علماء و فضلاء اپنی تحقیقات کو

مستقل تصنیف و تحریر کی شکل میں پیش کرنے کے بجائے، اپنے شاگردوں کے سامنے بیان کر دیتے تھے۔ گویا آج جس طرح درسگاہوں میں علمی مسائل پر لکچر دیے جاتے ہیں، ٹھیک اسی طرح عہد قدیم میں خطبات کا رواج تھا۔ فرق یہ ہے کہ آج لکچر ایک اضافی چیز ہے، مگر اُس زمانے میں ایک خطبہ ہی سب کچھ ہوتا تھا اور تعلیم و تدریس کا واحد ذریعہ وہی تھا۔ اساتذہ اپنے شاگردوں سے مختلف موضوعات پر خطبے دلواتے تھے۔ یہ گویا ان کی علمی استعداد اور قابلیت کا امتحان ہوتا تھا۔ جوں جوں تحریر و کتابت کا رواج بڑھتا گیا، خطبات کی اہمیت و مقبولیت میں کمی آتی گئی۔ یونان علم و حکمت کا گھر تھا اور اسی لیے وہ اپنے خطباء کی جادو بیانی اور علمی عظمت کے لیے مشہور ہے۔ یونان کے بعد علمی دنیا میں روما کا نمبر آتا ہے۔ رومی خطیب بھی تاریخ میں غیر فانی ہستی رکھتے ہیں۔ مشرق میں عربی خطباء اپنی فصاحت و بلاغت کے لیے ضرب المثل ہیں، مگر عربی خطیبوں کی تقاریر میں (حضرت علیؑ کی نہج البلاغہ کے علاوہ) علمی مسائل کی اتنی فراوانی نہیں ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ عربی خطباء صرف اپنی زباندانی اور قدرتِ کلام کا اظہار کرنے کے لیے منبر خطابت کو زیب دیتے تھے۔ عہدِ جدید میں خطابت کا رواج عام طور پر بہت کم ہے۔ ہماری مُراد ہندوستان سے ہے۔ ہندوستان میں مُقرر بہت سے ہیں مگر خطباء کی تعداد زیادہ نہیں ہے اور اگر کچھ خطیب ہیں بھی تو ان کے خطبے بہت کم قیدِ تحریر میں آئے ہیں۔ ہمارے ذخیرۂ علوم و مصنفات میں شمس العلماء مولوی نذیر احمد مرحوم اور سر سید اعظم کے خطبات تاریخی حیثیت رکھتے ہیں مگر ان میں اور خطباتِ مُشران میں بیّن فرق ہے۔ وہ خطبے یا تو ایسے ہیں جو اوّل مضمون نگاری کے اصول پر قلمبند کر لیے گئے، اس کے بعد مجلس میں پیش ہوئے یا اُن میں صرف تقریر کی شان ہے، خطبے کا انداز بیان نہیں، نیز ان میں خطباتِ مُشران کی برابر تنوع موضوع بھی نہیں پایا جاتا۔ اس لیے ہم ہر دو مذکورالصدر حضرات کی خطابت کی جامعیت کے متعلق کوئی رائے نہیں قائم کر سکتے۔ ان دونوں بزرگوں کے علاوہ جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے، کوئی مستقل اور

مہتم بالشان خطابیاتی مجموعہ اُردو میں مرتب نہیں ہوا۔ اس اعتبار سے پنڈت جی کے خطبات کا مجموعہ اور بھی قابل قدر ہو جاتا ہے، کیونکہ اس مجموعے نے ہماری زبان میں ایک ایسی تالیف کا اضافہ کیا ہے جس کی ہمپایہ مؤلفات کی اُردو ادب میں بہت کمی تھی اور اس کمی کے باعث ہمارا لٹریچر، روم و یونان و عرب کے ادبیات کا مقابلہ کرنے سے قاصر تھا۔

اس زمانے میں جبکہ بعض تنگ نظر حلقوں کی طرف سے زبان میں بھی فرقہ پرستی کے زہر کو داخل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے، مبارک ہیں وہ شخصیتیں اور وہ نفوس جو اپنی زبان اور اپنے ادب کی ترقی کے لیے بلا امتیاز مذہب و ملت اپنی بہترین کوشش صرف کر رہے ہیں۔ پنڈت جی کے خطبات پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا سینہ علم و حکمت کے پہلو بہ پہلو ایسے ہی صدق و صفا کا مخزن تھا۔ عالمِ انسانیت کے بہترین حکیموں اور بلند نظر فلسفیوں کی طرح ان کی نگاہ، رنگ، نسل، خون، جغرافیہ، سماج اور قوم و ملت کی تمام حد بندیوں سے بالاتر تھی۔ وہ عربی و فارسی و انگریزی کے بہترین عالم تھے۔ ان کو ادبی خدمات سے عشق تھا۔ انھوں نے ادب کے ہر شعبے میں کامل عبور اور حقیقی دستگاہ بہم پہنچائی تھی اور دماغ فلسفیانہ، زبان عارفانہ، فکر حکیمانہ اور دِل شاعرانہ پایا تھا ع

اے تو مجموعۂ خوبی بچہ نامت خوانم

ان کا مجموعۂ خطبات اکاون ۵۱ خطبوں اور تقریروں پر مشتمل ہے۔ اگر موضوع کے اعتبار سے ان کی تقسیم کی جائے تو اس مجموعے میں ادبی، سیاسی، مذہبی، تاریخی، طبّی، معاشرتی اور عام نوعیت کے خطبات ہیں۔ دو خطبے فنِ موسیقی سے تعلق رکھتے ہیں۔ بعض خطبات کسی خاص تحریک یا تقریب کے سلسلے میں ہیں۔ مثلاً مسلم یونیورسٹی اور ہندو یونیورسٹی کے لیے چندے کی اپیل وغیرہ۔ بعض رخصتی تقاریر ہیں بعض خطبے نیم سیاسی اور نیم تاریخی ہیں۔ جنگِ عظیم کے موضوع پر جس قدر خطبے ہیں وہ سب اسی ضمن میں آتے ہیں۔ بعض خطبے ایسے ہیں جن میں رہنمایان قوم و ملت یا بانیان مذاہب کے

اوصافِ حسنہ پر سبق آموز تبصرہ کر کے ایک خطیب کے فرائض انجام دیے ہیں، جو کہ شاعر کے بعد سب سے پہلے اصلاح ملک و قوم کا فطری حق رکھتا ہے۔ اس مجموعے کو دیکھ کر ہم مختصراً یہ کہہ سکتے ہیں کہ یقیناً پنڈت مُشران اُن گرانمایہ قوم پرستوں میں سے تھے جو ہندوستان کی واحد قومیت، ہندوستان کے مشترکہ ادب اور ہندوستان کے تمدنی خصوصیات کی بہترین ترجمانی کرتے ہیں۔ پنڈت جی کی شخصیت ہندو مسلم ملاپ کا ادبی اور انسانی سنگم تھی۔ اُن کے خطبات، اُن کی فراخدلی، صلح کل حکمت عملی اور انسانی عظمت و کمال کا گہرا اثر قلب پر ڈالتے ہیں۔ وہ ہماری اس ادبی تحریک کے علمبردار ہیں جو ہندو مسلم و دیگر اقوامِ ہند کی سوسائٹی کی مشترکہ ترقی اور ہم آہنگی کا نمائندہ ہے ــــــ وہ ادبی تحریک جس کا پودا ہند و عجم کی معتدل آب و ہوا میں نصب ہوا، مغل حکومت اور ہندی ریاستوں نے اس کی آبیاری کی، عوام نے بار آور کیا اور پنڈت جی کے ایسے نیک نفس اور عالی ظرف ادیبوں نے پروان چڑھایا۔

ہر زبان اور ہر ادب کی تخلیق کسی نہ کسی تمدنی، معاشرتی یا اور کسی نوع کے اعلیٰ ترین اور عظیم ترین عمرانی اور انقلابی مقصد کی تحصیل و تکمیل کے ماتحت ہوا کرتی ہے اور اُس زبان کے ادبیات میں صرف وہی تصنیف ایک باوقار جگہ پانے کی مستحق سمجھی جاتی ہے، جو اس مقصد سے بعید نہ ہو جائے۔ بنابریں یہ بیان کرنے سے پہلے کہ پنڈت جی کے خطبات میں کس حد تک یہ ادبی روح پائی جاتی ہے اور ان سے کس قدر وہ مقصد پورا ہوتا ہے جو اُردو کی تخلیق میں مضمر تھا، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اوّل اُردو کی ابتدا اور نشو و نما کے تاریخی مرقع پر ایک نظر ڈالی جائے اور اُردو ادب کے سماجی اور ذہنی پس منظر کو اور اُجاگر کر دیا جائے۔ یہ نہ صرف ایک دلچسپ علمی مشغلہ ہوگا بلکہ اس طرح ہم یہ بھی محسوس کریں گے کہ علم و ادب اور تمدن و تہذیب کی وہ کون سی فضا تھی جو پنڈت مُشران جیسے قوم پرست ادیبوں کو پیدا کرتی تھی۔ اس اہم مسئلے کا مختصر سا تذکرہ کرنے کے بعد ہم پنڈت جی کے زیرِ نظر خطبات کی ادبی اہمیت اور علمی پایگی کے متعلق اظہارِ خیال کریں گے اور بتائیں گے کہ اُردو کے بازار میں، وہ کیا قدر و قیمت رکھتے ہیں۔

فرانس کے غیر فانی ادیب ژان ژاک روسو کا مقولہ ہے کہ:۔

" اگر تم کسی سوسائٹی کی دماغی اور تمدنی کیفیات کا صحیح اندازہ لگانا چاہتے ہو تو اُس کے ادبی کارناموں کا مطالعہ کرو۔ یہ دیکھو کہ جس ادب کی وہ نمایندگی کرتی ہے وہ انقلاب و تغیر کے کتنے دَوروں اور عہد و زمانہ کی کتنی گردشوں سے گزر کر اپنی موجودہ شکل تک پہونچا ہے جب تم اُس کے ادب کے مختلف ادوار سے واقف ہو جاؤ گے تو تمھیں اس سوسائٹی کی تاریخی رفتار اور تدریجی تبدیلیوں کا پتہ لگانے میں آسانی ہوگی "

ان لفظوں میں روسو نے ادب کو قوموں کی اجتماعی زندگی اور سوسائٹی کی ذہنی کیفیت اور تدریجی ترقی کا معیار و مظہر قرار دیا ہے اور پھر ادب کی زبردست طاقتوں اور اس کے روحانی اور اخلاقی نتائج پر بحث کرتے ہوئے، ایک دوسرے مقام پر کہتا ہے:۔

" ادب انسانی تصور کو بلند تر اور ذہن و دماغ کو حقیر ترین تعصبات اور جانبداری کی گندگیوں سے پاک کرتا ہے۔ ادب کے مندر میں انسانیت کی دیوی اپنی پوری آب و تاب سے جلوہ گر ہوتی ہے اور وہ اپنے پجاریوں کو ذہن و دماغ اور علم و حکمت کی ایسی بلند ترین چوٹی پر لے جانا چاہتی ہے جہاں، رنگ، نسل، خون اور وطن کے امتیازات مٹ جائیں اور انسان، کاہنوں، مذہبی لیڈروں اور کلیسا کے علمبرداروں کی گرفت سے آزاد ہو کر حقیقی انسان بن سکے "

اسی حقیقت کو ایک دوسرے مصنّف نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے کہ:۔

" اگر دنیا کی حکومت ادیبوں اور شاعروں کے ہاتھ میں دے دی جائے تو نہ مذہب کے نام پر کبھی لڑائیاں ہوں اور نہ وطنیت کے لیے خانہ جنگیاں "

حقیقت بھی یہی ہے کہ ادب عالمگیر انسانی تصور کی نمایندگی کرتا ہے۔ وہ بین الاقوامیت کا ترجمان اور آزاد ضمیر و خیال کا نقیب ہے۔ حقیقی ادب وہی ہے جو اس معیار پر

پورا اُترے اور حقیقی ادیب وہی ہے جو اس معیار کو برقرار رکھنے کی کوشش کرے۔
آئیے متذکرہ حقیقتوں اور سچائیوں کی روشنی میں ہم اپنے ادب کا جائزہ لیں۔

روسو نے لکھا ہے کہ ادب سوسائٹی کی ترقیوں اور سماجی تبدیلیوں کا آلۂ حرکت پیما ہے۔ ادب کی انسانی قدر و قیمت کے متعلق کہا گیا ہے کہ حقیقی ادب، حقیقی انسانیت کا ترجمان ہے اور اسی کے ذریعہ، انسانیت کے مختلف اجزا کو ایک رشتۂ اتحاد و اخوت میں پرویا جا سکتا ہے۔ یعنی بین الاقوامی اتحاد و اتفاق قائم کرنے کا سب سے زیادہ مؤثر ذریعہ ادب اور صرف ادب ہے۔

ادبیات اُردو کی تاریخ ظہور و آغاز، اس کی عہد بعہد تبدیلیوں اور ارتقائی مدارج پر اگر ایک سرسری نظر ڈالی جائے تو آسانی کے ساتھ ہم اُردو کو ہندوستان کی مشترکہ سماجی ترقیوں اور متحدہ تہذیب و تمدن کی تشکیل و ترتیب کے مختلف مدارج میں کارفرما پا سکتے ہیں۔ اُردو ہندو مسلم کی شہرۂ آفاق تہذیبوں کا ایک ذہنی و دماغی سنگم ہے۔ اُردو کے حرف حرف اور نقطے نقطے پر ہندو مسلم اتحاد کی گہری چھاپ لگی ہوئی ہے۔ درحقیقت اُردو کا ظہور ہی اس تاریخی ضرورت کے ماتحت ہوا کہ مسلم نو واردوں اور ہندوستانی عوام کے درمیان کوئی مشترک رابطہ پیدا کیا جائے۔ قدرت نے ان تمدنی و معاشرتی ضروریات کی تکمیل کے لیے اُردو کا سانچہ بنایا اور اگر ہم یہ کہیں تو بجا ہے کہ آج وہ مشترکہ قومیت جس پر ہم اس قدر نازاں ہیں، ادب اور زبان کے اسی قدرتی سانچے سے ڈھل کر نکلی ہے۔

جب مسلمان نو وارد کی حیثیت سے ہندوستان میں آئے تو ہر قدم پر مہمان اور میزبان کو اختلاف زبان کی دقتیں محسوس ہونے لگیں۔ ہندوستان کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ہر قوم کو اپنا لیتا ہے اور پھر وہ قوم ہندوستان کی دوسری قوموں سے اس قدر گھل مل جاتی ہے کہ ملکی اور غیر ملکی اور اپنے اور پرائے کا سوال باقی نہیں رہتا۔ مسلمان ابتداً ہندوستان کے لیے اجنبی تھے۔ وہ شروع شروع میں اس عظیم الشان برّاعظم کے اندر تنہا سے نظر آتے تھے، لیکن

آہستہ آہستہ ہندوستان کا پوشیدہ جادو اُن پر اثر کر رہا تھا - وہ ہندوستانی ماحول اور ہندوستانی سماج میں غیر ارادی طور پر جذب ہوتے جا رہے تھے - جوں جوں ہندو اور مسلمان کے درمیان ارتباط بڑھتا جاتا تھا ، ایک ایسی قدرتی بولی خود بخود عالمِ وجود میں آتی جاتی تھی ، جو ہندو اور مسلمان دونوں کی محبوب اور دلپسند تھی - یہ بولی تمام بندشوں سے آزاد تھی - یہ زبان تمام حدبندیوں سے بلند تھی - اسے ادیبوں اور شاعروں کی کسی جماعت نے پیدا نہیں کیا تھا - اسے عوام نے پیدا کیا تھا - یہ عوام کی گود میں پلی تھی - اسے سوسائٹی کے نچلے طبقے اظہار خیالات کا ذریعہ بنائے ہوئے تھے - حقیقت یہ ہے کہ اُردو کی تخلیق کا سہرا کسی جماعت کے سر نہیں باندھا جا سکتا - وہ خود بخود اس طرح وجود میں آ گئی جس طرح تمام فطری طاقتیں مناسب وقت آنے پر ظہور میں آ جاتی ہیں - برکھا رُت میں زمین پر جو ننھے ننھے پودے لہلہانے لگتے ہیں ، ان کی تخم ریزی کوئی نہیں کیا کرتا - موسمِ بہار میں جگہ جگہ جو پھول کِھل جاتے ہیں ، اُن کی آبیاری کسی کے ذمّہ نہیں ہوتی - قدرت ان معصوم پودوں کی خود دایہ گیری کرتی ہے اور انھیں پروان چڑھاتی ہے - ہماری زبان بھی اسی قدرتی عمل کا نتیجہ ہے - تاریخ کا ہاتھ تیزی کے ساتھ ہندو مسلم تہذیبوں کے امتزاج سے ایک نئی تہذیب کو جنم دے رہا تھا اور اُردو اس نئی تہذیب کے بطن میں پرورش پا رہی تھی - مختلف قومیں ایک مرکز پر جمع ہو رہی تھیں - مختلف بولیاں ایک محفل میں بولی جا رہی تھیں - چمن میں بھانت بھانت کے پرندے تھے اور ہر ایک مختلف راگ الاپ رہا تھا - لیکن اس رنگا رنگی اور بیگانگی کے پردے میں ایک نیا یگانگت کا راگ پیدا ہو رہا تھا اور وہ نغمۂ نو اُردو کا نغمہ تھا -

اُردو کی اصل برج بھاشا اور فارسی کو بتایا جاتا ہے - برج کے علاقے میں جو زبان بولی جاتی تھی وہ شیریں ہندی زبان تھی - جب مسلمان سندھ کو عبور کر کے شمالی ہند میں پہونچے اور دہلی نئی حکومت کا پایۂ تخت قرار پایا تو ہندو مسلم اختلاط اور بڑھ گیا - سب سے پہلے مسلمان نو وارد کی حیثیت سے سندھ کے سواحل پر لنگر انداز ہوئے تھے

اور آہستہ آہستہ مغربی ہندوستان میں مسلمانوں کی چند چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم ہوگئی تھیں - ان ریاستوں کی سرکاری زبان عربی تھی اور ان کے درباروں پر بھی عربی تہذیب و تمدن کا اثر غالب تھا -

عربوں کی یہ ایک تاریخی خصوصیت رہی ہے کہ وہ جس سرزمین پر پہونچتے تھے اُسے اپنا لیتے تھے - وہ مقبوضہ علاقوں کے دل و دماغ کو بالکل اپنے سانچے میں ڈھال لیتے تھے - ایران اس کی ایک بہترین مثال ہمارے واسطے مہیا کرتا ہے - ایرانیوں کو اپنی تہذیب و تمدن پر ناز رہا ہے اور حقیقت بھی یہ ہے کہ ایشیائی قوموں میں ایرانی اپنی نفاستِ ذوق، پاکیزگیِ فکر اور ذہنی و دماغی اوصاف کے اعتبار سے ہمیشہ ممتاز رہے ہیں - فردوسی کہتا ہے کہ ؎

زشیرِ شتر خوردن و سوسمار — عرب را بجائے رسید است کار
کہ تاجِ کیاں را کنند آرزو — تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

لیکن جب عربوں نے ایران کو فتح کیا تو انہی اونٹ کا دودھ پینے والے بدویوں نے جمشید و کیخسرو کی سرزمین کے ذرّے ذرّے کو عربی رنگ میں رنگ دیا - عربی اثر سے ایرانیوں نے نہ صرف اپنا مذہب بدل دیا بلکہ اپنی قومی خصوصیات، اپنے ملکی رسوم، اپنی زبان، اپنی ہزار سالہ تہذیب، غرض اپنا سب کچھ اپنے فاتحوں کے حوالے کر دیا - عربوں نے ایران کے جنت نظیر سبزہ زاروں پر ہی قبضہ نہیں کیا تھا بلکہ ایرانی دل و دماغ کو بھی مسخر کر لیا تھا - بلاشبہ عرب بھی ایرانیوں سے متاثر ہوئے اور اتنے متاثر ہوئے کہ اپنی عربی روح تک کو بھول گئے - چنانچہ مورخین کا اتفاق ہے کہ خلافت عباسیہ، عجمی تہذیب اور ایرانی اثر و نفوذ کا مکمل نمونہ تھی - یہ ایک ضمنی بحث تھی جس سے یہ بتلانا مقصود تھا کہ عرب فاتحین کے ہاتھوں میں مسخر کرنے والے ہتھیار ہی نہ تھے بلکہ ان کے دماغوں میں دل فتح کرنے والی طاقت اور ان کی باتوں میں مَن مُوہنے والا جادو بھی تھا - ہندوستان میں کبھی خالص عربی حکومت قائم نہیں ہوئی - البتہ سندھ کے چند علاقوں میں کچھ دن کے لیے چند اسلامی ریاستیں برسرِ اقتدار آئیں -

اگرچہ ان کا سیاسی وقار بہت محدود تھا، لیکن اس کے باوجود سندھی زبان وتہذیب پر عربی ادب اور سماج کے جو نقوش ثبت ہوئے وہ محتاج اظہار نہیں۔ سندھی زبان میں آج تک عربی الفاظ ومحاورات کی کثرت ہے اور وہ عربی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔ ہندوستان میں عربی کے یہ اثرات سندھ تک محدود رہے۔ شمالی اور وسطی ہند میں جو اسلامی نَو وارِد داخل ہوئے وہ عرب نہ تھے، ایرانی، افغانی اور ترک تھے۔ لہٰذا ہندوستان میں اس کے بعد جو تہذیبی اور ادبی تحریکیں بار آور ہوئیں، ان میں عربی اثرات سے زیادہ ایرانی وترکی اور افغانی رنگ جھلک رہا تھا۔ چنانچہ اُردو جو ہندو مسلم ملاپ کا خوشگوار پھل ہے وہ عربی رنگ وبو کا سرمایہ دار نہیں بلکہ اس میں ایرانی حلاوت، افغانی پختگی، ترکی ذائقہ اور ہندوستانی رس، یہ چاروں عناصر بیک وقت پائے جاتے ہیں۔ ہم نے گزشتہ سطور میں فرانسیسی ادیب "ژان ژاک روسو" کا ایک مقولہ نقل کیا تھا کہ:-

"ہر قوم کا ادب اس کی تاریخی سماجی تبدیلیوں کا آئینہ ہوا کرتا ہے"

—— آیئے اُردو کے آئینے میں ہم ہندوستانی قومیت کی مختلف تاریخی اور سماجی تبدیلیوں اور تدریجی انقلابات کے خال وخط کا معائنہ کریں —— اگر ہم کسی ادبی تحریک کا تاریخی جائزہ لینا چاہتے ہیں تو خارجی شہادتوں سے قطع نظر تین پہلوؤں سے اس پر نظر ڈالی جائے گی تاکہ اس ادب کی حقیقی روح کو بے نقاب کیا جا سکے اور یہ بتلایا جا سکے کہ وہ تاریخی انقلابات کے کتنے دَوروں سے گزر کر اپنی موجودہ شکل تک پہونچا ہے۔ سب سے پہلے تو یہ دیکھنا پڑے گا کہ اس ادب کی تعمیر کن کن زبانوں سے ہوئی ہے یعنی کن کن مختلف زبان بولنے والی قوموں نے ادب کو پیدا کیا ہے۔ بطور مثال آپ فارسی ادب پر ایک نظر ڈالیے۔ خود فارسی زبان کے الفاظ، محاورات، لسانی تراکیب، مصطلحات اور مصادر وافعال آپ کو بتلادیں گے کہ فارسی ادب و زبان کو عربوں اور ایرانیوں نے پیدا کیا ہے۔ یہ ایک داخلی شہادت ہے اس ادب کے تاریخی ظہور و ارتقا کی —— آج ہم صرف فارسی زبان کی ساخت سے یہ اندازہ لگا سکتے ہیں

کہ یہ زبان ایک ایسی مشترک سوسائٹی نے پیدا کی تھی جو عربوں اور ایرانیوں پر مشتمل تھی۔ ان دونوں قوموں نے اپنے اپنے الفاظ، اپنے اپنے محاورات، اور اپنی اپنی مصطلحات اس نئی زبان کو دیں اور یہ رفتہ رفتہ اپنی موجودہ شکل میں آ گئی —— ضمنی طور پر فارسی زبان کی تشکیل سے اُن تعلقات و روابط کا پتہ چلتا ہے جو عربوں اور ایرانیوں کے درمیان تھے۔ ہم اُس زمانے کی پوری تاریخ محض فارسی زبان کے مطالعے سے سمجھ سکتے ہیں —— نئی فارسی زبان میں فرانسیسی اور انگریزی زبانوں کے الفاظ ہمیں نظر آتے ہیں۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ فارسی کے دامن میں ان لفظوں کی موجودگی ایران کے جدید سیاسی انقلابات کا براہ راست نتیجہ ہے۔ جس طرح قدیم فارسی زبان کے مطالعے سے (جس پر عربی اثر غالب تھا) ہم عرب ایرانی روابط کی وضاحت کر سکتے ہیں اُسی طرح نئی فارسی زبان اُن تاریخی واقعات کی طرف ہماری رہنمائی کرتی ہے جو ماضی قریب میں ایران کے اندر پیش آتے رہے اور اپنا دیرپا اثر ایرانی ادب اور سماج پر ڈالتے رہے۔

ادب کی لسانی ساخت کے علاوہ یہ معلوم کرنے کے لیے کہ یہ ادب ماضی میں کن کن سماجی، تاریخی اور مذہبی ماحولوں سے گزرا ہے ایک دوسرا طریقہ بھی ہے۔ وہ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اس ادب کے روایاتی پس منظر کا جائزہ لیا جائے۔ یعنی یہ دیکھا جائے کہ اس ادب میں کس کس قسم کی ادبی، تاریخی اور مذہبی روایات کی نمائندگی پائی جاتی ہے۔ بطور مثال انگریزی لٹریچر یونانی علم الاصنام کی کہانیوں سے بھرپور ہے۔ عربی ادب میں یہودی روایات اور مسیحی تلمیحات کی کثرت ہے۔ فارسی کی تمامتر روایات عرب سے ماخوذ ہیں۔ آپ فارسی ادب میں عشق و محبت کا قصصی اور مثالی کردار اگر تلاش کریں گے تو لیلیٰ مجنوں، وامق عذرا اور یوسف زلیخا کے رومان قدم قدم پر ملیں گے۔ فارسی ادب میں یہ روایات بالکل عام ہیں —— انگریزی لٹریچر میں یونانی علم الاصنام کی جھلک رومی برطانی اختلاط اور اُن تاریخی واقعات کی صریحی شہادت ہے جو رومن امپائر کے عروج و کمال سے وابستہ ہیں، جب جزیرۂ برطانیہ

رومی شاہنشاہیت کا ایک جزو تھا اور انگریزی دل و دماغ رومی اور یونانی اثرات سے معمور تھے۔ عربی ادب میں اسرائیلی اور مسیحی روایات کی موجودگی، عرب کی اُس ذہنی، دماغی اور سیاسی حالت کا قدرتی نتیجہ ہے جو قبل از اسلام وہاں پائی جاتی تھی۔ فارسی ادب میں عربی روایات کی کثرت، عربی ایرانی تعلقات اور مذہبی و تمدنی اتحاد کا واضح اور غیر مشتبہ ثبوت ہے۔

کسی ادب کی تاریخی و تمدنی قدر و قیمت کا اندازہ لگانے کے لیے ایک تیسرا طریقہ بھی استعمال کیا جاتا ہے یعنی اس ادب کے نفسیاتی رجحانات کو روشنی میں لایا جاتا ہے۔ ہر ادب میں ایک مخصوص روح پائی جاتی ہے، جو اُس قوم کے اجتماعی مزاج سے پیدا ہوتی ہے جس نے اُس ادب کی تشکیل میں حصہ لیا۔ فارسی ادب کے رنگین و لطیف رُجحانات ایرانیوں کے قومی شعور اور اجتماعی مزاج کی پردہ دری کرتے ہیں۔ عربی ادب کے رُجحانات ایک مخصوص کیفیت رکھتے ہیں۔ یہ مخصوص کیفیت درحقیقت عربوں کے نفسیاتی پس منظر کا عکس ہے۔

بہتر ہے کہ ہم اُردو کی تحریک ادبی اور تاریخی نشوونما کا جائزہ لینے کے لیے انہی تینوں طریقوں کو استعمال کریں۔ ہمارا دعویٰ ہے (اور یہ دعویٰ شروع ہی سے تسلیم کر لیا گیا ہے) کہ اُردو، ہندو مسلم تہذیبوں اور قومیتوں کے امتزاج و اتحاد کا نتیجہ ہے۔ آیئے اس دعوے کو امتحان کی کسوٹی پر پرکھیں۔

(الف) اُردو زبان کی ساخت برج بھاشا اور فارسی کے ملاپ سے ہوئی ہے۔ اُردو کی لسانی تشکیل اس کی گواہ ہے۔ اُردو کے تمام افعال و مصادر و روابط و حروف ہندی اور خالص ہندی ہیں۔ اُردو میں پچاس فی صدی اسماء ہندوستانی بولیوں سے لیے گئے ہیں۔ اس کے معنی کیا ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اُردو دو قوموں کے ارتباط سے ظہور میں آئی ہے۔ ایک وہ قوم جس کی بولی برج بھاشا تھی۔ دوسری وہ قوم جو فارسی زبان استعمال کرتی تھی۔ آپ ہندو مسلم تہذیبوں کے اتصال کا حقیقی پرتو اُردو میں دیکھ لیجیے۔ کیا ضرورت ہے کہ آپ ہندو مسلم تعلقات و روابط

کی تحقیق کے لیے تاریخی دلائل کے انبار لگا دیں۔ کیا فقط اُردو کی بناوٹ یہ نہیں بتاتی کہ ایسی ملی جُلی بولی صرف وہی قومیں بنا سکتی ہیں جن کے دل و دماغ ایک ہی سانچے میں ڈھل گئے ہوں۔

(ب) ادب اُردو کی روایات ہندو مسلم روایات اور علم الاصنام کے اتصال کا بہترین نمونہ ہیں۔ اُردو ادب شجاعت و جوانمردی کی روایات کا مظہر جہاں رستم و سہراب کو قرار دیتا ہے وہاں ارجن اور بھیم کو بھی نہیں بھولتا۔ روایات عشق و محبت کی ترجمانی ہم فقط لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد، گل و بلبل اور شمع و پروانہ ہی کے ذریعہ نہیں کرتے بلکہ نل دمن، بھونرا اور کنول، چاند اور چکور اور پپیہے اور کویل بھی عشق و محبت کے ادب اُردو میں بہترین کردار پیش کرتے ہیں۔ ہمارے ادب میں یوسف کا حُسن اور آدم و حوّا کی باہمی محبت ایک مثالیہ کیرکٹر کی حیثیت رکھتی ہے مگر جب عصمت و عفت کا آدرش قائم کرنا پڑے گا تو کون ہے جو سیتا کو بھول جائے۔ اُردو کا ادیب ظلم و شقاوت کا آئیڈیل نمرود و فرعون کے ساتھ راون کو بھی سمجھنے میں تامل نہیں کرتا۔ بیستوں کے افسانوں اور کوہ طور کے قصوں کے ساتھ ہم ہمالیہ اور بندھیاچل کے بھی گیت گاتے ہیں ؎

اے ہمالہ! اے فصیلِ کشورِ ہندوستاں
چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں

دجلے اور فرات کے کنارے گلگشت کرتے کرتے ہم گنگ و جمن کی وادیوں میں بھی جا سکتے ہیں۔ نوروز اور شب برات کے ساتھ دیوالی اور ہولی کے تذکروں سے بھی ہمارا لٹریچر معمور ہے۔ موسم بہار کے جشن شگوفہ کی افسانہ طرازی کے دوش بدوش برکھا رُت کی البیلی رنگینیاں بھی ہمارے لٹریچر کے مرقع میں نظر آتی ہیں۔ ہماری عشقیہ مثنویوں میں راجا اندر کے اکھاڑے کے ساتھ کوہ قاف کے پریزادوں کے حسن و جمال کی بھی تعریف ہے۔ غرضکہ آپ اُردو لٹریچر کا اوّل سے آخر تک جائزہ لیجیے، آپ کو ہندو مسلم روایات دوش بدوش نظر آئیں گی۔ یہ تمام چیزیں سماجی ملاپ کی گہرائی، مذہبی خیالات کی یکرنگی، اور ذہنی پس منظر کے اتحاد کی طرف

اشارہ کرتی ہیں۔ اُردو کی ساخت اور ادب اُردو کی مشترک روایات، ہندوستان کی قومیت مشترکہ کی نشانی ہیں ۔ تاریخ نے ہمارے دلوں ہمارے دماغوں اور ہمارے ذہنوں کو ایک ہی سانچے میں ڈھال دیا تھا۔ یہ سانچہ ادب اُردو کا سانچہ تھا، مشترک تمدنی روایات کا سانچہ تھا، متحدہ قومیت کا سانچہ تھا۔ اگر آج ادب اُردو کو ہمارے درمیان سے اُٹھا دیا جائے تو متحدہ قومیت، مشترکہ ہندوستانی سماج اور ہندی ایرانی تہذیب (انڈو ایرین کلچر) کی تمام شاندار روایات مہمل ہو کر رہ جائیں گی ۔ اُردو اور صرف اُردو اُن ہزار سالہ کوششوں کی شہادت دے سکتی ہے جو ہندوستانی قوموں نے باہمی یکجہتی اور اتحاد کے لیے سماج، تمدن، فلسفے، عقیدے اور تہذیب کے ہر گوشے میں کیں۔ ہم نے اپنی پیاری زبان کو پریم کا بندھن اور محبت کا رشتہ بنا کر ٹوٹے ہوئے دلوں اور بکھرے ہوئے دماغوں کو ایک دوسرے سے جوڑ دیا ۔ اُردو کے دامن میں ہر زبان کے لفظ ہیں، پنجابی، سندھی، فارسی، ترکی، عربی، بنگالی، مرہٹی، انگریزی، پرتگالی، لاطینی، فرانسیسی۔ غرض مشرق و مغرب میں جتنی جاندار بولیاں اور ترقی یافتہ زبانیں ہیں سب سے اُردو نے استفادہ کیا ہے ۔ آپ ایک سرسری نظر ہی میں ان لفظوں کو تلاش کر سکتے ہیں اور اس سے اُردو کی ہمہ گیری اور جامعیت کا اندازہ ہو سکتا ہے ۔ چپّا معمولی سا لفظ ہے جسے ہم روزانہ بولتے ہیں مگر یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ اُردو نے اسے پنجابیوں سے لیا ہے ۔ باورچی، چلمن، آقا ترکی زبان سے لیے گئے ہیں۔ نیلام پرتگالی ہے ۔ گلاس انگریزی ہے ۔ یہ لفظ بطور مثال زبان پر آگئے ہیں ورنہ اُردو کے خزانے میں مختلف النوع جواہر ریزوں کی کمی نہیں ؂

اُردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغؔ
ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

(ج) یہ معلوم کرنے کے لیے کہ ہمارا ادب ہندوستان کی ہزار سالہ سماجی تبدیلیوں اور تمدنی ترقیوں کی کس حد تک نمائندگی کرتا ہے، ہم نے اُردو کی لسانی بناوٹ اور روایاتی پس منظر کو بطور تمثیل پیش کیا ۔ اس سلسلے میں یہ بتانا ضروری ہے کہ اگر

ہمیں ہندو مسلم تہذیبوں کو صحیح طور پر ایک دوسرے کے قریب لانا ہے تو ان نفسیاتی رجحانات سے فائدہ اُٹھانا پڑے گا جو ادب اُردو کا طرۂ امتیاز ہیں۔ کہنا یہ ہے کہ ہر سوسائٹی کا ایک خاص مزاج ہوتا ہے، ہر قوم کا ایک مخصوص زاویۂ نظر ہوا کرتا ہے اور اس کے ادب میں بھی وہی مخصوص قومی روح پائی جاتی ہے جو اس قوم یا اس سوسائٹی کی خصوصیت ہوتی ہے۔ انگریزی لٹریچر میں جو نفسی کیفیت پائی جاتی ہے یعنی انگریزی ادب و شعر کے مطالعے سے آپ پر جو اثر پڑتا ہے، وہ حقیقت میں برطانی قوم کی مخصوص اجتماعی روح کا تاثر ہے۔ عرب جاہلیت کے قصائد سے ہم آج بھی ایامِ جاہلیت کی قومی روح کو محسوس کر سکتے ہیں۔ ہم اِمرؤُالقیس، زُہیر اور ایامِ جاہلیت کے دوسرے شعرائے عرب کے قصیدوں میں عربی نفسیات، عربی شعور اور عرب کی اجتماعی زندگی کے نقوش کی جھلکیں دیکھ سکتے ہیں۔ ایرانی لٹریچر ایرانیوں کی نفسی زندگی اور ان کے قومی تاثر و احساس کی ترجمانی کرتا ہے۔

اُردو ادب کا بھی ایک خاص نفسیاتی مزاج ہے، ایک مخصوص اثر ہے جو اُردو نظم و نثر کا مطالعہ ہم پر ڈالتا ہے۔ اُردو لٹریچر کے رجحانات اور امکانات کا جائزہ لینے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے ادب میں مختلف ادبی رجحانوں، مختلف سماجی نظریوں اور مختلف دماغی تحریکوں کو اپنانے کی غیر معمولی صلاحیت ہے۔ اُردو ایک ایسا جاذب ہے جو ہر نقش کو جذب کر لیتا ہے۔ ماضی بعید میں اس نے ہندی اور فارسی کی قابلیتوں کو چُوسا۔ دکن میں پہونچی تو مرہٹی، تامل، تلنگو اور دوسری مقامی بولیوں کا دودھ پیا۔ دہلی دربار میں ترکوں سے سابقہ پڑا تو ترکی سے مانوس ہو گئی۔ جب اٹھارھویں صدی میں دانایانِ فرنگ نے سرزمینِ ہند پر قدم رکھا تو اُردو نے ان اجنبیوں کی آؤ بھگت کی اور آج اُردو لٹریچر مغربی ادب سے جس قدر متاثر ہو چکا ہے وہ محتاجِ بیاں نہیں —— اُردو ادب کا مطالعہ ہمیں ایک خاص زاویۂ نظر قائم کرنے پر مجبور کرتا ہے اور وہ زاویۂ نظر ہے، ہندوستانی قومیت کے مخصوص رجحانات کا —— اُردو میں ایک طرف ہندو قوم کا حِلم،

سادگی اور نرمی ہے تو دوسری طرف مغل ایرانیوں اور ترکوں کی شان وشکوہ۔ اُردو میں کبت بھی ہیں اور نظمیں بھی، دوہے بھی ہیں اور غزلیں بھی، ویدانت بھی ہے تصوف بھی، برہمنیت بھی ہے اسلامیت بھی، راجپوتی آن بان بھی ہے اور عربی شکوہ وشان بھی۔ اُردو ادب کا مزاج ہندوستانیوں کے عام اجتماعی مزاج کی طرح حلیم، بُردبار اور ملنسار ہے۔ انگریزی ادب وتمدن کے اثر سے ہمارے رجحانات میں جو تبدیلیاں ہوئی ہیں ادب اُردو ان کا بھی آئینہ دار ہے۔ ہمارا قومی مزاج تاریخ کی دس گزشتہ صدیوں میں جن فکری منزلوں اور شعوری مرحلوں سے گزرا ہے، ہمارا ادب ان سب کے اثرات اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے اور ایسا ہونا ناگزیر تھا، کیونکہ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں ادب ہی کسی قوم کی سماجی اور فکری گہرائیوں کے ناپنے کا آلہ ہے۔

ان تمام حقیقتوں کے دُوہرانے کا مدعا یہ ہے کہ ہندوستان میں گزشتہ ہزار سال کے اندر جس قدر سیاسی، سماجی، مذہبی اور فکری انقلابات ہوئے ان کی گود میں اُردو نے جنم لیا۔ مسلمانوں کا ہندوستان میں داخلہ ایک شدید انقلاب کی تمہید تھا۔ مسلمان ہندوستان کے دروازے میں داخل ہو کر ایک ایسی دنیائے قدیم کی حدود میں باریاب ہوئے تھے جہاں چار ہزار برس سے ایک مخصوص تہذیب کا دیا جل رہا تھا، علوم وفنون کا اُجالا پھیلا ہوا تھا۔ ہندوستان بھی مصر، بابل، یونان، روم اور چین کی طرح اپنے شاندار ماضی پر فخر کر سکتا ہے۔ ہندوؤں نے دنیائے عتیق ہی میں اپنی ذہانت سے تہذیب کے اُن تمام مدارج کو طے کر لیا تھا جو دنیا کی دوسری قوموں نے سیکڑوں ہزاروں برس بعد طے کیے۔ ہندوستان کسی وقت بھی نیم وحشی اور غیر متمدن نہیں رہا۔ کم سے کم تاریخ کی جہاں تک یادداشت ہے اس نے ہمیشہ ہندوستان کو شعر، ادب، موسیقی، ریاضی، نجوم، ڈراما، قانون اور روحانیت کا گہوارہ پایا ہے۔ مسلمان جب ہندوستان میں داخل ہوئے تو اگرچہ اس وقت یہ عظیم مُلک اخلاقی اور سیاسی حیثیت سے عالمِ زوال وانحطاط میں تھا، مگر چار پانچ ہزار برس میں آریوں نے جس قدر دماغی وعلمی ترقیاں کی تھیں،

اُن سب کے نقوش باقی تھے - البیرونی جو غزنویہ عہد میں ہندوستان آیا تھا جی کھول کر ہندوستانی کمالات کی داد دیتا ہے - اس نے ہندوستانی علوم ریاضی کو حیرت اور تعجب کی نظروں سے دیکھا اور اپنے سفرنامے میں ہندوؤں کو دنیا کی سب سے زیادہ عالم و ریاضی داں قوم قرار دیا۔ مسلمان ہندوستان میں اپنے علوم اپنے ساتھ لائے، ان کی تہذیب، ان کا تمدن، ان کی زبان اور ان کی قومی خصوصیات ہندوؤں سے جُداگانہ تھیں، مگر اب یہ اجنبیت و بیگانگی باقی نہ رہ سکتی تھی کیونکہ اِدھر ہندوؤں کو بھی نئے مہمانوں کی مزاجدانی اور نئی دنیا کی ہمزبانی ضروری تھی۔ مسلمان ہندوستان کو فتح کرنے نہیں اپنا وطن بنانے آئے تھے اور جس ملک کو وہ اپنا وطن قرار دے چکے تھے قدرتی طور پر وہ اس کے دوسرے باشندوں سے بیگانہ اور آزاد نہ رہ سکتے تھے - جب دو برابر کی طاقتیں آپس میں ملتی ہیں تو کچھ دیر تک تو ان میں کشمکش کی سی کیفیت رہتی ہے لیکن اس کے بعد اعتدال پیدا ہوجاتا ہے اور وہ رفتہ رفتہ ایک دوسرے سے یکجان و دو قالب ہوکر ایک ایسی بہتر و پسندیدہ تر شکل اختیار کرلیتی ہیں جس میں دونوں عنصروں کی بہترین صلاحیتیں موجود ہوں - بسا اوقات دو مختلف پودوں کا پیوند بارآور ہوکر اس قدر لطیف، بامزہ اور خوشگوار پھل پیدا کرتا ہے کہ وہ خصوصیات پہلی صورت میں ہرگز نہ پیدا ہوسکتی تھیں - ہندو مسلم تہذیبیں بھی اسی قانون قدرت کے ماتحت پہلے پہل متصادم رہیں لیکن اس کے بعد ان میں قربت و یکجائی پیدا ہونے لگی - اس تہذیبی اتصال کے جو نتائج برآمد ہوئے اس کی سب سے زیادہ دلکش مثال اُردو ہے - ہمیں نہیں معلوم کہ اُردو میں شاعرانہ سرگرمیوں کا آغاز کب ہوا؟ تاریخ صرف اتنا پتہ دیتی ہے کہ وہ سب سے پہلا شاعر جس نے اس نئی بولی کو مُنہ لگایا لاہور کے عہدِ غزنویہ کا ایک ادیب سعد سلیمان تھا - سعد سلیمان کے تذکرے میں لکھا ہے کہ اس نے ہندوستانی میں اپنا کچھ کلام مرتب کیا تھا، اتفاق کی بات ہے کہ سعد کے تذکرہ نویسوں نے اس کی اس خصوصیت کا ذکر بھی کردیا ورنہ معلوم نہیں کتنے شوخ طبع لوگوں نے اس نئی بولی میں (جو ابھی تک عوام میں مروج نہ تھی) اپنی موزونیت طبع کے پھول کھلائے ہوں گے جو کہ بغیر مہکے ہوئے گمنامی کی

بادِ سموم سے کھلا کر رہ گئے۔

بلا شبہ اُردو کی ترویج و ترقی میں اُن صوفیوں اور مبلغوں کا بھی کافی حصّہ ہے جو مذہبی تبلیغ یا خدا پرستی کے شوق میں عوام کی تہذیب و اصلاح کی غرض سے دور دور نکل گئے تھے اور خدا کی باتیں بندوں کو ان کی اپنی زبان میں سکھاتے پھرتے تھے۔ صوفیہ کے تذکروں میں ان کے اکثر وہ ملفوظات و اقوال نقل کیے گئے ہیں جو اس دعوے پر بطور ثبوت و دلیل پیش کیے جا سکتے ہیں۔

جب ہم اُردو کے ماضی پر نظر ڈالتے ہیں تو بیساختہ ہماری نظریں امیر خسرو پر ٹھہر جاتی ہیں جن کے گیت ہمارے گھروں میں آج تک گائے جاتے ہیں، جن کی پہیلیاں ہمیں اب تک یاد ہیں، جن کی کہہ مکرنیاں، جن کے بول اور جن کی کہاوتیں آج بھی ادب اُردو کی قدامت کے نشان ہیں۔ امیر خسرو ہندوستانی نژاد تھے۔ اس لیے انھوں نے ہندوستانی میں جو کچھ لکھا وہ اپنی مادری زبان میں لکھا۔ انھیں قدرت نے طبع موزوں اور قدرتِ نظم دی تھی، اس لیے وہ جو کچھ فرما گئے وہ ہمیں اب تک ازبر ہے مگر ان کے علاوہ سیکڑوں ہزاروں آدمیوں نے اس زبان میں کچھ نہ کچھ کہا اور سُنا ہوگا لیکن ان کی گمنامی ان کے تمام کارناموں کو لے ڈوبی۔ اس بحث میں یہ بیان کر دینا بھی خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ اُردو کا حقیقی سرچشمہ ہندوستان کی کونسی بولی ہے۔ ہمارے صوبے کے لائق مصنّف اور مشہور اہلِ قلم ڈاکٹر تاراچند صاحب اُردو کی قومی اہمیت اور اس کی لسانی اصلیت پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:-

> "اس وقت ہندوستان میں جتنی بولیاں مروّج ہیں ان میں سے کوئی بھی سنسکرت سے نہیں نکلی۔ یہ کہنا غلط ہے کہ جدید ہندی سنسکرت سے مشتق ہے۔ وہ ہرگز سنسکرت سے نہیں نکلی بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اس وقت ہماری قومی زبانوں میں کوئی بھی سنسکرت سے مشتق نہیں"

—— اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے تاریخی دلائل سے اس حقیقت کو ثابت کیا ہے کہ اُردو میں ہندو سماج کی مناسب حصّہ داری اور ان کی تمدنی زندگی کی پوری پوری نمایندگی

پائی جاتی ہے - ڈاکٹر صاحب نے ان لوگوں پر سخت نکتہ چینی کی ہے جو اُردو کو ایک بدیسی زبان بتلانے کی جرأت کرتے ہیں، اسی ضمن میں موصوف نے اُردو اور جدید ہندی کو ایک ہی اصل کی دو شاخیں اور ایک ہی زبان کی دو شکلیں بتلایا ہے۔ آپ کے الفاظ ہیں کہ

"اُردو ہندی کو دو مختلف زبانیں ثابت کرنے کی کوشش احمقانہ اور طفلانہ ہے - سنسکرت آمیز ہندی اور عربی آمیز اُردو کا پروپیگنڈا کوئی صحت مند قومی تحریک نہیں کیونکہ اس سے فرقہ پرستی کے رجحان اور علٰحدگی کی پالیسی کو مدد ملتی ہے - ہندوستان کی مشترکہ وعمومی زبان (لنگوا فرنیکا) میں ہندوستانی قومیت کے تمام اجزاء کی نمایندگی ہونا چاہیئے اور اس لیے ہر وہ کوشش ناکام رہے گی اور تفرقہ پیدا کرے گی جو کسی ایسی زبان کو ہندوستان کی قومی زبان بنانے کے لیے کی جائے گی جس کی بنیاد ایک مخصوص تمدن کی روایات پر ہو"

ہندوستان کی قومی زبان کے مسئلے پر آپ نے پنڈت جواہر لال نہرو کے مندرجۂ ذیل خیالات کو بطور ثبوت پیش کیا ہے - پنڈت جی فرماتے ہیں کہ :-

"مجھے ذرا بھی شبہ نہیں کہ ہندی اور اُردو کو اب ایک دوسرے کے قریب تر آجانا چاہیئے"

مہاتما گاندھی نے اس بحث میں اس طرح حصّہ لیا ہے کہ :-

"میں ایک ایسی انجمن بنانا چاہتا ہوں جس کے ارکان دونوں بولیوں کو سیکھیں اور دونوں کے رسم الخط سے واقف ہوں اور اس کا پروپیگنڈا بھی کریں اور یہ سب اس اُمید پر کہ بالآخر دونوں مل کر ہندوستانی کے نام سے ایک بین الصوبجاتی زبان بن جائے گی - پھر یہ تمیز نہ ہوگی کہ یہ ہندی ہے اور یہ اُردو - بلکہ ہندی اور اُردو (جو اصلاً ایک ہی ہیں) مشترکہ ہندوستانی زبان کے طور پر ہر صوبے اور ہر گوشے میں استعمال کی جائیں گی"

حقیقت بھی یہی ہے کہ اُردو اور جدید ہندی کے افعال و مصادر، بناوٹ، قواعد

اور دوسری لسانی خصوصیات میں کوئی فرق نہیں - ہزاروں محاورے باہم مشترک ہیں۔ خیالات کے سانچے اور اظہار و بیاں کے طریقے یکساں اور یکرنگ ہیں - صرف رسم الخط کا فرق ہے اور یہ فرق زبان کی اصلیت پر اثر انداز نہیں ہوتا -

ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو نے کیا خوب لکھا ہے کہ :-

" اُردو ہم سب کا مشترکہ ورثہ ہے ، جسے ہمارے بزرگوں نے اتحاد اور ملاپ کی نشانی کے طور پر ہم سب کے لیے چھوڑا ہے - ضرورت ہے کہ ہم سب اپنے اس انمول ورثے کی قدر کریں "

ہمارا سر عقیدت و ارادت کے ساتھ جُھک جانا چاہیئے ان بزرگوں کے آستانے پر جن کی پُر خلوص کوششوں نے ہماری قومی زبان کی تشکیل کی ، ہمیں مشترکہ خیالات و احساسات دیے ، مشترکہ سماجی طریقے ، مشترکہ رسمیں اور مشترکہ خصوصیتیں عطا کیں - یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے اسلامی حکومتوں کے عہد میں ایک نئی بولی کو رواج دیا - جہاں گئے اُسے سینے سے لگا کر لے گئے ، جس محفل میں بیٹھے اسی کے گُن گائے - آج انہی کی کوششوں سے اُردو پشاور (سرحد) سے منی پور (آسام) اور سری نگر سے مدراس تک بولی ، سمجھی ، پڑھی اور لکھی جاتی ہے -

برادران ہنود اپنے علمی شوق ، اپنی ذہانت اور اپنی بے نظیر قوت آخذہ کے لیے ہمیشہ سے مشہور ہیں - اسلامی حکومتوں کے زمانے میں انھوں نے بہت جلد حالات کا جائزہ لے کر اپنے کو مقتضائے حال کے متناسب اور متوازن بنا لیا - انھوں نے فارسی زبان کی طرف غیر معمولی توجہ کی اور عہد مغل کے شعرا کا اگر کوئی تذکرہ مرتب کیا جائے تو یقیناً ایسے ہندو بزرگوں کی کافی تعداد ہمیں ملے گی جو فارسی زبان اور شیرازی لہجے میں داد سخن دیتے تھے - بنابریں مغلیہ عہد ہندو مسلم اتحاد و یکجہتی کا سنہرا عہد تھا - اکبر و جہانگیر کی قومی پالیسی نے ہمیں آپس میں اس قدر قریب تر کر دیا تھا کہ اس سے زیادہ قرب اپنا انفرادی وجود باقی رکھ کر ممکن نہ تھا - ہندو اور مسلمان دونوں ایک ہی رنگ میں شرابور اور ایک ہی کیفیت میں سرشار تھے - مغلیہ حکومت خالص ہندوستانی حکومت تھی - مغل بادشاہوں کے

ترکی خون میں ہندوستانی روح دَوڑ رہی تھی - انھوں نے ہندوستان کے درمیان سے ہر قسم کی غیریت اور بیگانگی ختم کردی تھی - مغل تاجداروں نے ہندو رسوم و عادات کو اپنا لیا تھا - ان کے درباروں پر ہندو مُسلم ملاپ کا گہرا رنگ چھایا ہوا تھا - مغلیہ حکومت کی سب سے بڑی خصوصیت یہ بھی تھی کہ اکبر، جہانگیر، شاہجہاں اور اُورنگ زیب کے درباروں میں مسلمان شعراء اور اربابِ قلم کے پہلو بہ پہلو ہندو شعراء اور اہلِ فکر بھی دادِ سخن دیتے تھے - چنانچہ اس زمانے میں ہم اکثر ہندو شعراء کے نام دیکھتے ہیں۔ چندر بھان برہمن عہد شاہجہانی کا مشہور شاعر تھا - ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

مرا دلیست بکفر آشنا کہ چندیں بار بکعبہ بُردم و بازش برہمن آوردم

--- چندر بھان برہمن کا دیوان دستبردِ زمانہ سے محفوظ نہیں رہا مگر تذکروں میں ان کے جتنے شعر بھی ملتے ہیں لاجواب اور انتخاب ہیں - چندر بھان برہمن کے علاوہ اور بہت سے ہندو شعراء ہندوستانی قومیت کے اس سُنہرے زمانے میں موجود تھے۔ کیا عجیب لطف ہے کہ اس زمانے میں ہم اکثر مسلمانوں کو سنسکرت سے غیر معمولی دلچسپی لیتے ہوئے پاتے ہیں - ملک محمد جائسی، عبدالرحیم خانخاناں اور عہد اکبری کے دوسرے اُمراء سنسکرت اور ہندی ادب کے بہترین ادیبوں میں شمار ہوتے ہیں۔ درحقیقت مغلیہ عہد میں تمام فرقہ وارانہ اختلافات مٹ چکے تھے - ہندو اور مسلم تہذیبیں اس طرح ایک دوسرے سے آمیز اور یکجاں ہوگئی تھیں کہ مذہب، خیالات، عقائد، فلسفے اور تاریخ کے تمام مختلف طریقے اور مظاہر فنا ہو گئے تھے - اس میں شک نہیں کہ اکبرِ اعظم نے متحدہ ہندوستان کا جو خواب دیکھا تھا اس کی تعبیر بہت جلد نکل آئی اور اب تک اُردو کے بھیس میں ہمارے سامنے یادگار کے طور پر موجود ہے -

جس زمانے میں اکبر شمالی ہند میں اس جدید ترقی پذیر ہندوستانی قومیت کی سرپرستی اور آبیاری کر رہا تھا اُس زمانے میں جنوبی ہند کے اسلامی فرمانروا بھی اس فرض سے غافل نہ تھے - عادل شاہیوں اور قطب شاہیوں کے درباروں پر بھی ہندوستانی اثرات چھائے ہوئے تھے بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ جنوبی ہند کی

اسلامی ریاستوں میں ہندو مسلم اتحاد کی بنیاد جس قدر گہری تھی شمالی ہند کو بھی وہ خصوصیت حاصل نہ تھی اور اس کے کچھ تاریخی اسباب بھی تھے کیونکہ جنوبی ہند میں اسلامی حکومت کا قیام ایک برہمن اور ایک مسلمان کی متحدہ کوششوں کا نتیجہ تھا۔

دکن میں اُردو کو جو فروغ حاصل ہوا وہ ایک طویل داستان ہے۔ خود قطب شاہی اور عادل شاہی خاندانوں کے فرمانروا اس نئی زبان کے سرپرست تھے۔ جب قدرت نے دکنی عظمت و اقبال کی بساط اُلٹی اور بیجاپور اور گولکنڈے کی اسلامی ریاستیں تباہ ہوئیں تو اہل کمال کا یہ جمگھٹا منتشر ہو گیا۔ مغل حکومت نے جنوبی ہند میں اپنا مستقر جاہ و اقبال اور مرکز جاہ و جلال اورنگ آباد کو قرار دیا۔ جہاں عالمگیر کے موکب شاہی کے ساتھ شمالی ہند اور جنوبی ہند کے تمام ارباب فضل و کمال اور شعراء جمع ہو گئے۔

جدید اُردو ادب کا باوا آدم وؔلی دکنی کو سمجھا جاتا ہے (اگرچہ محققانہ زاویۂ نگاہ سے یہ صحیح نہیں) وؔلی کو اورنگ آباد کا باشندہ بتلایا جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ اورنگ آباد ان کا آبائی وطن نہ ہو لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ وہ اورنگ آباد اسکول کے ایک نامور رکن تھے۔ اس زمانے میں جنوبی ہند کے تمام ادبی حلقے اس نئی زبان کے ترانوں سے گونج رہے تھے مگر شمالی ہند میں فارسی کا سکہ چلتا تھا اور شمالی ہند کے ہندو اور مسلم ارباب کمال اردوئے معلیٰ میں کچھ کہنا اپنے علم و فضل کی توہین سمجھتے تھے۔ وہ اگر کبھی اس نئی زبان میں کچھ کہتے بھی تھے تو بر سبیل نشاط و تفنّن ——— لیکن جنوبی ہند میں دکنی اُردو کا ہی بول بالا تھا۔ وہاں بادشاہ، اُمراء اور عوام اپنی زبان ہی کو اپنے لیے باعثِ فخر سمجھتے تھے۔ شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد نے لکھا ہے کہ وؔلی دکنی کا جنوبی ہندوستان سے دہلی آنا اُردو تاریخ کا ایک سُنہرا باب ہے۔ وؔلی اپنے ساتھ اپنا اُردو دیوان بھی لائے اور اس شان سے آئے کہ دہلی میں وؔلی ہی وؔلی نظر آنے لگے۔ ہمیں اس موقع پر اُردو کی مفصل تاریخ پر نظر ڈالنا نہیں ہے۔ سطور بالا میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے، اس کا منشا صرف اتنا تھا کہ عہد مغل کی ادبی روح بے نقاب ہو جائے اور یہ معلوم ہو جائے کہ اس زمانے کی ادبی فضا، قومی اشتراک

اور ذہنی اتحاد کا کتنا مکمل نمونہ اور کتنا شاندار منظر تھی۔

اب ہمیں اس بحث میں ایک خاص نقطے تک پہونچنا ہے۔ یوں تو ہندوستانی قوم کے ہر طبقے اور ہر جماعت نے اپنی پیاری زبان اور اپنے قومی ادب کی تشکیل میں حصّہ لیا لیکن اگر ہم اُردو ادب کے مشاہیر شعر وسخن کا ایک سرسری سا جائزہ لیں تو ہمیں یہ تسلیم کر لینا پڑیگا کہ اُردو شعراء کے ہندو طبقے میں کایستھ اور براہمنۂ کشمیر کا جس قدر حصّہ ہے، اس کی مثال ہماری سوسائٹی کا کوئی دوسرا حلقہ مشکل ہی سے پیش کر سکتا ہے۔ کایستھ حضرات اور کشمیری پنڈتوں میں بڑے بڑے لوگ پیدا ہوئے اور انھوں نے اُردو ادب پر غیر معمولی احسانات کیے۔ ان دونوں برادریوں میں اُردو فارسی کا ذوق اب تک عام ہے۔ آپ آج بھی کشمیری خاندان میں بہت سے فضلاء اور ادباء کو پا سکتے ہیں۔ کشمیر کی صحت مند، توانا اور ولولہ خیز آب وہوا بے اثر نہیں رہ سکتی۔ کشمیر کی جو فردوس بداماں وادیاں، روح پرور پھول کھلاتی ہیں وہ ولولہ خیز دل ودماغ بھی پیدا کرتی ہیں۔ عرفیؔ نے کہا ہے

ہر سوختہ جانے کہ بہ کشمیر در آید　　　گر مرغ کباب ست کہ با بال وپر آید

اللہ اللہ جس سرزمین بہشت آئین میں یہ خصوصیت ہو کہ وہ مرغِ کباب کو دولت بال و پَر اور مشت خاک کو نعمتِ برگ و ثمر بخش دے، وہ انسانی دل ودماغ، انسانی ذہن و روح بلکہ انسانی وجدان وضمیر کو کن کن الہامی طاقتوں اور روحانی تازگیوں سے معمور نہ کر دیتی ہوگی۔ کشمیری پنڈت اپنی غیر معمولی ذہانت، اپنی طبعی ذکاوت اور اپنی جودتِ فکر کے اعتبار سے ہندوستان بھر میں مشہور ہیں۔ بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ ڈاکٹر سر محمد اقبال بھی اسی خانوادۂ علم وادب اور گہوارۂ ذہانت وذکاوت سے تعلق رکھتے تھے۔ یعنی آپ اصلاً کشمیر کے ایک معزز برہمن خاندان کے رکن تھے۔ وہ خود اپنے ایک شعر میں اپنے اس تعلق کی طرف اس طرح اشارہ کرتے ہیں ؎

مرا بنگر کہ در ہندوستاں دیگر نمی بینی　　　برہمن زادۂ رمز آشنائے روم وتبریز است

علامۂ اقبال مرحوم کو اُردو اور فارسی ادبیات کی تاریخ میں جو بلند پایہ اور غیر فانی مقام حاصل ہے اس کا اظہار بے سود ہے۔ علامۂ اقبال سے قطع نظر کشمیری پنڈتوں کی

تاریخ اُن ناموروں کے تذکروں سے معمور ہے جو ہمارے لٹریچر میں بلند ترین درجہ رکھتے ہیں۔ اُردو کا کون بھی خواہ ایسا ہوگا جس کا سر عقیدت اُردو نثر کے زندۂ جاوید ادیب اور اُردو افسانہ نگاری کے موجد و پیشرو پنڈت رتن ناتھ سرشار کے سامنے خم نہ ہو جائے، جن کا فسانۂ آزاد اور سیر کوہسار اُردو ادب کے لیے سرمایۂ افتخار ہیں اور جنھوں نے ہمیں سب سے پہلے سماجی زندگی کی تصویر کشی کی اور کردار نگاری کے اصول سے آشنا کیا۔ اگر اُردو ناول نگاروں میں پنڈت رتن ناتھ سرشار کو اولیت یا اولویت کا درجہ حاصل ہے تو اُردو مثنوی نگاروں کی تاریخ میں پنڈت دیا شنکر نسیم کا نامِ نامی بھی کسی تعارف کا محتاج نہیں، جن کی مثنوی گل بکاؤلی، حسنِ بیاں، شکوہ ادا، نزاکت تخئیل، کمال فن، قدرت سخن اور محاسن لفظی و معنوی کا ایک جمیل شاہکار ہے۔ یوں تو اُردو زبان میں بہت سی مثنویاں لکھی گئیں مگر جو شہرت اور مقبولیت سحرالبیان اور گلزار نسیم کو حاصل ہوئی اس کی مثال نہیں مل سکتی۔ ان میں سے اوّل الذکر مثنوی خدائے سخن میر انیس کے جد مرحوم میر حسن کی رعنائیِ فکر کا نتیجہ ہے اور ثانی الذکر پنڈت دیا شنکر نسیم کی موزونیت طبع کا شاہکار۔

——پنڈت دیا شنکر نسیم کے بعد ادبی دنیا میں چکبست کا نام آتا ہے جو براہمنۂ کشمیر کے نامور رکن تھے۔ چکبست کا مقام ہمارے شعرا میں کس درجہ بلند ہے؟ اس حقیقت کو اس طرح سمجھ لیجیے کہ مرحوم متاخرین شعرائے اُردو کے اس طبقے میں تھے جو جدید رنگِ سخن کے اعتبار سے سخنوران متقدمین میں شمار ہوتا ہے۔ یعنی چکبست بھی اقبال، اکبر، حالی، اور شوق قدوائی کی ادبی بزم کے معزز رکن تھے۔ ان کی شاعری کا پس منظر قومی احساس کی کارفرمائی اور ہندوستان کے سیاسی انقلابات پر مشتمل ہے۔ پنڈت چکبست پر لکھنؤ کی سرزمین بجا طور پر نازاں ہے۔ چکبست کی نظمیں، چکبست کے مقالات اور چکبست کے مضامین، غرض چکبست کا تمام مجموعۂ نظم و نثر، علوئے تخئیل، عذوبت بیان، گیرائی نظر، ہمہ گیری طبع، حسنِ ادا اور لطافت اظہار کا ایک طلسم ہے۔ عہد جدید میں کون ہے جو سر تیج بہادر سپرو، علامہ برج موہن دتاتریہ اور پنڈت موتی لال مرحوم کی سیاسی ذہانت، ادبی خدمات اور قومی جوش و خروش کو نظر انداز کر سکے۔ پنڈت موتی لال مرحوم آج اگرچہ

ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں لیکن ان کے لائق فرزند اور ہندوستان کے جلیل القدر رہنما پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنے والد بزرگوار کے ذوق علم و ادب کا ذکر ان لفظوں میں کیا ہے کہ:۔

"بچپن میں انھوں نے رواج کے مطابق عربی و فارسی تعلیم حاصل کی تھی اور تمام عمر مشرقی لٹریچر کے مطالعے کا شوق انھیں دامنگیر رہا۔ اس معاملے میں اُن کی نظر بہت وسیع اور معلومات ہمہ گیر تھیں۔ وہ قدیم ہندوستانی تہذیب کا مکمل نمونہ تھے"

—— خود پنڈت جواہر لال نہرو کی ابتدائی تعلیم بدایوں کے ایک فارسی عربی داں منشی کے زیر اہتمام ہوئی تھی، جن کی شاندار داڑھی اور غدر کے بیان کردہ درد انگیز افسانوں کا تذکرہ پنڈت جی نے کمال دلچسپی سے اپنی سوانح عمری میں کیا ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو اپنے مورثِ اعلیٰ کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنی آپ بیتی میں لکھتے ہیں کہ:۔

"ہمارے مورثِ اعلیٰ کو فرخ سیر بادشاہ دہلی اپنے ہمراہ کشمیر سے لائے تھے۔ وہ عربی فارسی کے علامہ تھے اور ہمارے خاندان میں ان کی جو تصویر محفوظ ہے وہ مغلیہ لباس میں ہے۔ اس تصویر میں وہ ایک شاندار مغل کے روپ میں نظر آتے ہیں"

ان بیانات سے کشمیریوں کی سماجی زندگی، مشترکہ ہندوستانی قومیت سے ان کا لگاؤ اور عربی فارسی کی طرف ان کے طبعی رجحان کا پتہ چلتا ہے۔ سر تیج بہادر سپرو فقط ملک کے ایک سرکردہ مدبر اور مقنن ہی نہیں ہیں بلکہ انجمن ترقی اُردو کے صدر مستقل بھی ہیں۔ سر تیج بہادر سپرو کو اپنی قومی زبان، اُردو سے جو شغف ہے اس سے اُردو کا ہر بہی خواہ واقف ہے۔ اکیلے سر تیج بہادر سپرو نے اُردو کے لیے جو کام کیا ہے اُسے ہزار آدمی بھی مل کر نہیں کر سکتے۔ تمام ہندوستانی رہنماؤں میں سر تیج بہادر سپرو کو ہی یہ شرف حاصل ہے کہ وہ زبان کے مسئلے کو اس کی صحیح اسپرٹ میں دیکھتے ہیں اور ہندوستان کے مشترکہ تمدنی ورثے کی حفاظت میں زبان اور قلم دونوں سے جہاد کرتے رہتے ہیں۔ علامہ برج موہن دتاتریہ

تو مجتہد ادب اور امام فن کا درجہ حاصل کر چکے ہیں - علمی نقادوں اور ادبی کارکنوں کی صف میں ان کے علمی ذوق اور ادبی سرگرمی کا جواب مشکل ہی سے مل سکتا ہے - یہ تو وہ نام ہیں جو کشمیری ادیبوں کے تذکرے میں بے ساختہ زبانِ قلم پر آ گئے - ان کے علاوہ کتنے ہی ادیب، کتنے ہی اہلِ قلم اور کتنے ہی مفکر اس خانوادۂ علم و ادب میں پیدا ہوئے اور پیدا ہوتے رہیں گے - آج مغربی علوم کی گرم بازاری نے عام ہندوستانیوں میں مشرقی ادبیات کا ذوق و شوق بہت حد تک کم کر دیا ہے لیکن جہاں تک کشمیری اربابِ مذاق کا تعلق ہے وہ مغربی علوم میں دستگاہ کامل اور مہارت تام حاصل کر لینے کے باوجود بھی اپنے مشرقی علوم سے کسی نہ کسی حد تک دلچسپی اور شغف رکھتے ہیں ؎

کسیکہ محرم بادِ صباست می داند   کہ باوجود خزاں بوئے یاسمیں باقیست

ہمارے ممدوح پنڈت سندر نراین مشران مرحوم کا تعلق بھی اسی نامور علمی برادری سے تھا - پنڈت جی کی نظر کس قدر عمیق، فکر کس درجہ روشن اور ادبی نظرت کتنی ہمہ گیر اور رنگ رنگ تھی، اس کا اندازہ تو خطباتِ مشران کے مطالعے ہی پر موقوف ہے، لیکن ان کی زندگی بھی علم و ادب اور خدمت و ایثار کے اعتبار سے کچھ کم دلچسپ نہیں ہے اور وہ ہر وقت ہمارے لیے سبق آموز ہو سکتی ہے - آئیے ان کے کمالات ادبیہ اور نوادر علمیہ کے تذکرے سے قبل پنڈت جی کی حیات مستعار کے بعض پہلوؤں پر بھی ایک نظر ڈالتے چلیں کہ اسلاف کی زندگی اخلاف کے لیے ایک درس عمل، ایک اُسوۂ ترقی اور ایک سیرت تمثیلی ہوتی ہے، جس کے آئینے میں آنے والی نسلیں اپنے خدوخال اور اپنے مستقبل کے نقش و نگار کا مشاہدہ کیا کرتی ہیں ؎

نام نیک رفتگاں ضایع مکن   تا بماند نام نیکت یادگار

پنڈت سندر نراین مرحوم فرخ آباد کے ایک معزز و موقر خاندان کے چشم و چراغ تھے - آپ نے ایک ایسی فضا اور ایسے ماحول میں آنکھیں کھولی تھیں جو علم و ادب کے تذکروں سے معمور تھا - ان کے والد ماجد پنڈت لچھمی نراین مشران، فرخ آباد کے مشہور رئیس اور بزرگ تھے - آپ کو شعر و سخن سے طبعی مناسبت تھی اور مفتوںؔ تخلص

فرماتے تھے۔ پنڈت لچھمی نراین مشران مرحوم سماجی اعتبار سے بھی ایک بلند پوزیشن رکھتے تھے۔ آپ آنریری مجسٹریٹ اور میونسپل کمشنر ہونے کے باوجود انتہائی سادہ مزاج اور درویش صفت انسان تھے۔ اس اعتبار سے شعر و ادب کا علمی و ادبی ذوق پنڈت سُندر نراین مشران مرحوم کے لیے نہ صرف ذاتی اور انفرادی دلچسپی کی حیثیت رکھتا تھا بلکہ وہ ان کے والد بزرگوار کا روحانی ترکہ اور معنوی ورثہ بھی تھا، جس کی قدر و قیمت صرف وہی محسوس کر سکتے تھے۔ خود بھی اپنے والد مرحوم کی طرح علوم عربیہ میں دستگاہ رکھتے تھے جس کا ثبوت ان کے خطبات و تقاریر کے حرف حرف سے ملتا ہے۔

پنڈت مشران مرحوم کا دل دردِ قومی اور سوز و گدازِ ملّی کا آتشکدہ تھا۔ انھیں سماجی اصلاح اور خدمت ملک و وطن کی سچی دُھن تھی۔ وہ فطرۃً ایک اعتدال پسند اور روشن خیال انسان تھے۔ شروع ہی سے انھوں نے اپنے آپ کو قومی خدمات کے لیے وقف کر دیا تھا اور چونکہ وہ انتہا پسندانہ اور جذباتی ہنگاموں سے گریز کرتے تھے اور جذبات کی ادھا دھند رہنمائی کے بجائے عقل و شعور کی روشنی میں قدم اُٹھانے کے عادی تھے، اسی لیے پبلک کے ہر طبقے میں ان کی قدر تھی۔ حکام ان کے پُرخلوص تعاون کے خواستگار رہتے تھے اور عوام ان کی مدبرانہ رہنمائی کے اُمیدوار۔ اپنے مُلک کے اخلاقی انحطاط اور دماغی زوال کو دیکھ کر ان کا حساس دل برداشت نہ کر سکا اور انھوں نے اپنے اصلاحی خیالات خطبات کے ذریعے ادا کرنا شروع کیے۔ سچائی ضایع نہیں جاتی، خلوص رائگاں نہیں ہوتا، پنڈت جی کی زبان پہ سچائی، دل میں خلوص اور ہر تیور میں عزمِ صمیم کی جھلک تھی۔ کیسے ممکن تھا کہ ان کی عظیم شخصیت اپنے معاصرین سے اپنی اہمیت و جامعیت کا لوہا نہ منوالیتی۔ تھوڑے ہی عرصے میں وہ فرخ آباد کی سب سے زیادہ محبوب شخصیت بن گئے اور ہر انجمن ان کے تذکروں سے اور ہر سبھا ان کے چرچوں سے معمور نظر آنے لگی ؎

زفرق تا بہ قدم، ہر کجا کہ می نگرم ۔۔۔ کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجا است

مرحوم کو قدرت نے فقط جادو نگار قلم ہی نہیں دیا تھا بلکہ سحر کار زبان بھی عطا کی تھی۔

اور تحریر و تقریر کی یہ جامعیت اور زبان و قلم کی یہ مہارت بہت کم انسانوں کے حصے میں آتی ہے۔ ہم کہہ چکے ہیں کہ آپ ہر بزم کی رونق اور ہر سبھا کا سنگھار تھے۔ عوام و خواص آپ کی تقریر سننے کے مشتاق رہتے تھے۔ جب کسی جلسے میں آپ کی تقریر کا اعلان ہوتا تھا تو پبلک کا ذوق و شوق دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ آپ کی تقریر، فصاحت و بلاغت، حسن بیاں اور تاثیر ادا کا ایک طلسم ہوتی تھی۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ الفاظ و معانی کا ایک بحر بیکراں ہے کہ اُبل رہا ہے۔ آپ کو لفظوں پر قدرت کامل اور ادائے خیالات کی غیر معمولی دستگاہ حاصل تھی۔ آپ بولتے تھے اور بولتے چلے جاتے تھے اور تقریر کے دوران میں تاریخی لطائف اور ادبی نکتے، اس خوبی سے پیش کرتے جاتے تھے کہ مجمع پر جادو کی سی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ خشک سے خشک موضوع کو آپ کی سحر بیانی اور ہمہ دانی رنگین اور دلچسپ بنا دیتی تھی۔

آپ کی تقاریر میں کس قدر ربط اور تسلسل پایا جاتا ہے اور دلائل و براہین کی دردبست، موضوع سے مطابقت اور علمی مواد کی کس درجہ فراوانی ہوتی ہے؟ اس کے ثبوت میں یہی خطبات پیش کیے جا سکتے ہیں، جن کے متعلق یہ بتلایا جا چکا ہے کہ یہ اپنی اصل شکل میں ہیں اور ان میں کسی قسم کی ترمیم و تنسیخ نہیں کی گئی۔ پنڈت جی کی زبان سے جو لفظ جس نہج و اسلوب سے ادا ہوا تھا، اس مجموعے میں وہ اسی نہج و اسلوب سے موجود ہے۔ درحقیقت یہ مرحوم کی تقاریر کا اصلی ریکارڈ ہے۔ انصاف کیجیے، کیا کسی معمولی اور غیر قادر الکلام خطیب اور مقرر میں یہ روانیِ بیان اور یہ تسلسل ادا پایا جاتا ہے یا پایا جا سکتا ہے؟

آپ کی درخشاں زندگی کی یہ خصوصیت بیان کرنا لازم ہے کہ آپ قومی امراض کے صرف نباض ہی نہ تھے بلکہ چارہ گر بھی تھے۔ جہاں آپ کی زبان دردِ قومی کی مرثیہ خوانی کرتی تھی، وہاں آپ کا ہاتھ عقدہ ہائے ملک و ملت کا گرہ کشا بھی تھا۔ دنیا میں علم و عمل کا امتزاج بہت کم دیکھا گیا ہے۔ فردوسی نے سیستان کے ایک شہزور کو قولاً رستم بنا دیا ؎

منش کردہ ام رستم داستاں   وگرنہ یلے بود در سیستاں

—— مگر عملاً خود دربار غزنوی سے اپنے لیے انصاف بھی نہ حاصل کر سکا۔ مقصد یہ ہے کہ کہنے اور کرنے میں بہت فرق ہوتا ہے مگر پنڈت مشران مرحوم کی زندگی علم و عمل کا مکمل نمونہ تھی۔ وہ جو کچھ کہتے اور محسوس کرتے تھے اُسے کرتے اور عمل میں بھی لاتے تھے۔ پنڈت جی تمام عمر فرقہ وارانہ کشمکش اور جماعت بندی کے خلاف زبان و قلم سے جہاد کرتے رہے مگر انھوں نے ع

نشستند و گفتند و برخاستند

پر ہی اکتفا نہیں کی، بلکہ فرخ آباد میں ہندو مسلم اتحاد کے لیے یونٹی بورڈ قائم کیا اور عرصے تک اس کی صدارت کے فرائض انجام دیے۔ درحقیقت یہی وہ مقام ہے جہاں انسانی قول و فعل کی صحیح عظمت اپنی پوری شان سے نظر آتی ہے۔

یوں تو مرحوم نے اپنے ادبی ذوق کی بہترین یادگار خطبات کی شکل میں ہمارے لیے چھوڑی ہے لیکن فرخ آباد پبلک لائبریری کا ذرہ ذرہ بھی آپ کی علمی خدمات کا ایک مستقل نقش پیش کر رہا ہے۔ محض علم و ادب کی ترویج و اشاعت اور پبلک کے مذاق کی اصلاح کے لیے، آپ نے ۱۸۹۹ء میں اس لائبریری کا سنگ بنیاد رکھا اور اپنی زندگی ہی میں اس کی ترقی و بقا کے تمام سامان فراہم کر دیے۔ جب یہ لائبریری اپنے وجود کی تینتیس ۳۳ منزلیں طے کر چکی تو ۱۹۳۲ء میں پبلک نے اعتراف خدمات کے طور پر لائبریری ہال میں پنڈت جی کے نام کا سنگ یادگار نصب کر دیا، جو ابد الآباد تک علم و ادب کے ساتھ مشران کی وابستگی کا مستقل و مستحکم ثبوت دیتا رہے گا۔ آپ نے اس لائبریری میں ہر علم و فن اور ہر زبان و ادب کی بہترین کتابیں جمع کر دی ہیں اور اس لائبریری کے ذخائر علم و ادب اور نوادر حکمت و تحقیق کو دیکھ کر پنڈت جی کے ذوق انتخاب کی داد دینا پڑتی ہے۔ اِس لائبریری کا محل وقوع بھی بہت دلچسپ اور پُربہار ہے۔ شاید حافظ کے اس مصرع کا صحیح استعمال اسی مقام پر ہو سکتا ہے کہ ع

فراغتے و کتابے و گوشۂ چمنے

آنجہانی پنڈت موتی لال نہرو نے آپ کی خدمات کا اعتراف ان لفظوں میں کیا تھا کہ

"مشران صاحب تاریخ، فلسفہ، سیاست، ادب اور عمرانیات
کے بہترین عالم ہیں، جن کی ادبی و علمی خدمات فرخ آباد میں پبلک لائبریری
قائم کرنے اور اس کی بقا کے اسباب فراہم کرنے کے باعث کبھی فنا نہیں ہو سکتیں"
یہ پنڈت موتی لال نہرو کے الفاظ ہیں، جو اُن دماغوں میں سے تھے، جن پر ہندوستان
کو بحیثیت مجموعی آج تک فخر ہے۔

مشران مرحوم بہ حیثیت انسان بھی اپنی مثال آپ ہی تھے۔ حد درجہ سیر چشم،
مہمان نواز، متواضع اور خلیق۔ ان کا مکان اہل کمال کا مرکز تھا اور ان کی صحبت بزرگانِ سلف
کی بزم آرائی کا نمونہ، فرخ آباد کے تمام ادارے بلا امتیاز مذہب و ملت ان کے دستِ کرم
کے ممنون اور چشمِ التفات کے محتاج تھے۔ وہ قومی کاموں میں جی کھول کر حصہ لیتے
تھے اور شاید ہی ملک کی کوئی ایسی مفید تحریک ہو جس میں مشران مرحوم پیش پیش نہ رہے
ہوں اور اپنی انتھک کوششوں سے اپنے دائرۂ اثر میں اسے کامیاب نہ بنایا ہو۔

پنڈت جی فطرۃً معتدل اور احتیاط پسند دل و دماغ کے مالک تھے اور غالباً وہ
تمام ہندوستانی رہنما، جو بعد میں سیاسی اعتبار سے انتہا پسند اور باغی کہے جانے لگے،
اپنی پبلک زندگی کے آغاز میں اعتدال پسند سیاست دانوں میں شمار ہوتے تھے۔ گاندھی جی
کی سیاسی زندگی کا یہ واقعہ دلچسپی سے سُنا جائے گا کہ پچھلی جنگِ عظیم میں انھیں جنگی خدمات
کے صلے میں خوشنودی سرکار کا پروانہ اور تمغہ ملا تھا، مگر پچھلی لڑائی ختم ہونے کے بعد جو سنگین
واقعات رولٹ ایکٹ، پنجاب کی فوجی بھرتی اور جلیانوالہ باغ کی خونچکاں شکل میں
پیش آئے، انھوں نے ہندوستانی لبرل اِزم کا خاتمہ کر دیا اور ماضی کے اعتدال پسند
حال و مستقبل کے سب سے بڑے باغی اور انتہا پسند بن گئے۔ پنڈت سندر نراین مشران
نے گزشتہ جنگِ عظیم کے موقع پر مساعی جنگ کے سلسلے میں جو تقاریر کی تھیں وہ اس مجموعے
کا اہم حصہ ہیں۔ ان کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۱۶ء لغایت ۱۹۲۱ء کے حادثات
سے قبل وہ سیاسی حیثیت سے کس نظریے پر عامل تھے اور کس درجہ سلامت روی، سنجیدگی
اور خود ضبطی ان کا شعار تھا۔ لیکن لڑائی ختم ہونے پر ملک میں جو سیاسی زندگی شروع ہوئی

اور پنجاب میں جو حادثات پیش آئے انھوں نے پنڈت جی کے صبر و احتیاط کے بند توڑ کر جذبات کی سیل تند رو کو آزاد کر دیا۔ جس طرح جلیانوالہ باغ کے سانحہ خونیں سے متاثر ہو کر ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور نے سر، کا خطاب حکومت ہند کو واپس کر دیا، اسی طرح پنڈت جی نے بطور احتجاج سرکاری اعزاز و مناصب ترک کر دیے اور آنریری مجسٹریٹی اور منصفی سے دستبردار ہو گئے۔

ایک مرتبہ سیاست کے میدان میں اُترنے کے بعد یہ ممکن نہ تھا کہ مشران کسی سے پیچھے رہیں۔ اب وہ کانگریس کی روح رواں تھے۔ تحریک خلافت کے دست و بازو تھے۔ نوجوان ان کی جرات عمل پر دنگ اور پیران آزمودہ کار ان کے جوش و خروش پر انگشت بدنداں تھے۔

بہت کم مشاہیر دنیا میں ایسے گزرے ہیں جن کی موت بھی ان کی زندگی کی طرح شاندار اور پُر عظمت ہو۔ مشران کی موت بھی ان کی زندگی کی طرح موثر اور یادگار تھی اور یہ ان کی خصوصیت بھی بے نظیر اور عدیم المثال ہے۔ ۷ جنوری ۱۹۳۶ء کو فرخ آباد میں ایک عظیم الشان مشاعرہ تھا۔ جس کی شرکت کے لیے دیگر اربابِ کمال کے علاوہ، شاعرِ انقلاب حضرت جوشؔ ملیح آبادی بھی فرخ آباد تشریف لائے ہوئے تھے۔ مجمع کا یہ عالم تھا کہ تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ سخن فہموں، سخن سنجوں اور سخن گویوں کے اس بلند پایہ اجتماع کی مسند صدارت پر مشران جلوہ گر تھے۔ مشاعرے کا آغاز پورے ذوق و شوق اور جوش و خروش کے عالم میں ہوا۔ مشران خطبۂ صدارت پڑھنے کے لیے کھڑے ہوئے۔ مجمع پر ایک نظر ڈالی۔ موزوں لفظوں میں شعرا اور اربابِ سخن کا تعارف کرایا، پھر مشاعرے کے اغراض و مقاصد واضح کیے۔ اس کے بعد ادبِ اردو پر ایک عالمانہ تقریر شروع کی۔ دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ اس وقت پنڈت جی پر عجب کیفیت طاری تھی۔ یہ محسوس ہوتا تھا کہ ان کی تمام روح لب و دہن میں سمٹ آئی ہے اور علم و حکمت کے دریا بہا رہی ہے۔ درمیان میں جا بجا موزوں اور برجستہ اشعار پڑھتے جاتے تھے۔ خود بھی وجد میں تھے، سامعین بھی وجد و کیف کے عالم میں تھے۔

کہ ناگہاں مشران کی زبان سے ایک شعر ادا ہوا اور خاموشی چھا گئی۔ لوگوں نے سمجھا کہ وجد و حال کا غلبہ ہے مگر حقیقت اور کچھ تھی۔ زندگی کا ساز آخری نغمے کے بعد خاموش ہو گیا ؎

مرگیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالبؔ ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسیٰ نہ ہوا

کیا ایسی شاندار موت کسی اور شاندار زندگی کو بھی نصیب ہوئی ہے؟ کیا شعر و ادب کی محفل میں کسی اور شاعر و ادیب نے بھی یوں جان دی ہے؟ بیشک شہیدِ ادب کا خطاب مشران ہی کے لیے ہے اور وہ واقعی شہیدِ ادب تھا بھی۔

یقیناً مشران کی موت قابلِ فخر موت ہے۔ اگر زندگی فنا و زوال کی کشمکش سے آزاد بھی ہوتی تب بھی جینے والے ایسی موت کی خواہش کرتے ؎

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

خطباتِ مشران پر ایک تنقیدی نظر!

تمہید۔ فن خطابت۔ ادب و سماج۔ اُردو کے محرکات ارتقاء اور اسباب ظہور۔ اُردو میں ہندو مسلم ادباء کا حصّہ۔ ہندوستانی قومیت اور مشترکہ سماج کی تشکیل۔ نونہالانِ کشمیر کی ادب نوازیاں اور پنڈت مشران مرحوم کی زندگی کے خصوصیات۔ ان تمام ابتدائی اور وسطی مرحلوں سے گزر کر اب ہم اس بحث کے اختتامی یا مرکزی نقطے تک پہونچ رہے ہیں۔ اب تک ہم نے جو کچھ بیان کیا وہ اُردو کی تاریخی اہمیت اور پنڈت جی کی انفرادی خصوصیات کی ایک دلچسپ داستان تھی۔ ناگزیر تھا کہ مُشران کی ادبی روح اور ان کے خطبات کی صحیح اور حقیقی اہمیت کو واضح کرنے کے لیے ان تمام نقاط بحث کو چھیڑا جائے۔ کیونکہ ہم نے اپنے ممدوح (ہیرو) کو ایک ایسے ادیب کی شکل میں پیش کیا ہے جو ہندو مسلم اتحاد کا مکمل نمونہ اور ادب اُردو کا سچا خادم تھا۔ ہم نے اس بحث کا خاصہ حصہ ایک خاص مسئلے کی تشریح و وضاحت میں صرف کر دیا ہے۔ وہ مسئلہ بدقسمتی سے

اُردو اور ہندی کے فرقہ پرستانہ تصادم کا مسئلہ ہے - اس سلسلے میں ہم نے ڈاکٹر تارا چند اور سر تیج بہادر سپرو کے کچھ اقوال نقل کیے ہیں - اب ہم پنڈت مُشران مرحوم کے زاویۂ نظر کی تشریح کرنا چاہتے ہیں -

تاریخی طور پر یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ وہ زبان جس کو ہم لوگ اُردو، ہمارے بزرگ ہندی اور غیر ملکی ماہرین السنہ (گیرسن و تاسی وغیرہ) ہندوستانی کہہ کر پکارتے ہیں، کوئی بدیسی بولی نہیں ہے بلکہ یہ خالص ہندوستانی پیداوار ہے - جس میں ایرانی، ترکی، عربی اور بعد کو عربی ادبیات کی رنگ آمیزیاں شامل ہو گئی ہیں - یہ زبان یہیں پیدا ہوئی، یہیں پروان چڑھی اور یہیں بولی جاتی ہے - آپ اسے اُردو کے نام سے پُکاریے یا ہندی کہیے - ناموں کی تبدیلی سے اس کی نوعیت میں کوئی فرق نہیں پڑتا - یہ زبان ہزار برس کی سماجی ترقیوں اور تمدنی ملاپ کا نتیجہ ہے - آئیے دیکھیں، پنڈت مشران اس مسئلے میں کیا رائے رکھتے ہیں - آپ نے ایک ادبی محفل کی صدارت کرتے ہوئے اُردو ہندی مسئلے پر ان لفظوں میں اظہارِ خیال کیا تھا کہ :-

"لوگ آج کل اُردو ہندی کے سوال کو مذہبی رنگ میں پیش کر کے غلامانہ ذہنیت کی بنیادیں مستحکم کر رہے ہیں اور ایک بھائی دوسرے بھائی کی زبان کاٹنے پر تُلا ہوا ہے - یہ کوئی نہیں سوچتا کہ اگر دونوں گونگے ہو گئے تو متمدن اقوام کی نظر میں ہندوستان کی کیا وقعت رہ جائے گی - ہم کو قومی تعمیر اور ملکی تنظیم کے لیے اس غیر ضروری سوال کو چھوڑ کر دوسری سیاسی گُتھیوں کے سلجھانے کی کوشش کرنا چاہیئے - اُردو کہو یا ہندی، میرے خیال میں یہ دونوں ایک ہی زبان کے دو نام ہیں - اگر اُردو کو عربی اور ہندی کو سنسکرت نہ بنایا جائے تو نتیجے میں ہم ہندو اور مسلمانوں کی زبان وہی ایک رہ جاتی ہے، جو مصلحِ قوم اکبر اعظم کی تربیت کردہ اور ہندو مسلمان اتحاد کی بولتی ہوئی یادگار ہے"

درحقیقت پنڈت جی کے متذکرۂ بالا الفاظ ہماری تمام خامہ فرسائی کا نچوڑ ہیں -

پنڈت جی نے اکبر اعظم کی مساعی اتحاد کی طرف اشارہ کر کے ہندوستان کی پچھلی تاریخ کے اُن پہلوؤں کی طرف بلیغ اشارہ کیا ہے جن پر ہم سطور بالا میں روشنی ڈال چکے ہیں۔ آپ نے اُردو اور ہندی کو ایک ہی زبان قرار دیا ہے اور تاریخی اعتبار سے صحیح تر بھی یہی ہے کہ ہندی اور اُردو کی لسانی بناوٹ میں کوئی فرق د امتیاز نہیں۔ پنڈت جی نے اپنے خطبات میں جا بجا اس چیز کی طرف اشارہ کیا ہے۔ خود ان کے خیالات، اس حقیقت کی واضح تفسیر تھے۔ پنڈت جی کو اسلامی تاریخ، اسلامی ادبیات اور اسلامی روایات پر غیر معمولی عبور حاصل تھا۔ ہم اس سے پہلے بتا چکے ہیں کہ قدرت کے غیر مرئی ہاتھ نے کس طرح ہندوستانی قوموں کے اتحاد کے لیے روایات، تہذیب، عقائد، فلسفہ اور خیالات کے مشترک سانچے بنائے تھے اور انہی مشترک سانچوں میں قومیت متحدہ کی پرورش ہوئی، جو آج ہم سب کے لیے باعث افتخار ہے۔

پنڈت جی کے خطبات وتقاریر کا مطالعہ، گہرے ادبی مسائل کی واقفیت اور علمی، تاریخی نکات کے حصول کے لیے ناگزیر ہے۔ آپ چٹکلوں میں وہ گُر بتا جاتے ہیں جو مستقل علمی تصانیف کی ورق گردانی کے بعد ہی حاصل ہو سکتے ہیں۔ یقیناً ان خطبات کے مطالعے سے نظر میں وسعت اور علم میں اضافہ ہوتا ہے۔

خالی از دلچسپی نہ ہوگا اگر اس سلسلے میں پنڈت جی کے بعض خطبوں کے کچھ اقتباسات بھی پیش کیے جائیں۔ آپ نے شعر و شاعری کی عظمت پر جو خطبہ ۲۸ اپریل ۱۹۲۶ء کو ایک ادبی محفل کی صدارت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا، حقیقتہً وہ بجائے خود ایک جامع مقالہ ہے جو فن شعر کی عظمت اور شعراء کے اندازِ بیان پر تحقیقی روشنی ڈالتا ہے۔ ضمنی طور پر اس خطبے سے پنڈت جی کے زور بیاں اور تسلسل کلام کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ ایک شخص بغیر کسی تحریری یادداشت کی مدد کے، اتنے اہم موضوع کو کمال خوبی اور تسلسل سے کس طرح بیان کر سکتا ہے۔

آپ نے اس خطبے کے آغاز میں شعراء کی اہمیت کا تذکرہ کیا ہے اور یہ بتلایا ہے کہ عرب اپنے شاعروں کو کس قدر عزیز و قابل فخر سمجھتے تھے۔ مثال میں پنڈت جی نے

کسی شاعر کا ایک شعر پیش کیا ہے جس سے شاعر کی قدرت وطاقت کا اندازہ ہوتا ہے۔ شاعر فخریہ انداز میں کہتا ہے کہ ؎

یکے را ز سر اندر آرم بچاہ یکے را ز چہ بر فرازم بماہ

——جس کو چاہوں خاک میں ملا دوں اور جس کو چاہوں آسمان پر بٹھا دوں۔ عربی شعرا کے اثر واقتدار کے تذکرے کے بعد، آپ نے عجمی شعراء کا تذکرہ کیا ہے اور بطور مثال فردوسی اور محمود کا واقعہ پیش کیا ہے کہ محمود نے بڑی بڑی سلطنتوں کا نام ونشاں مٹا دیا اور بڑے بڑے سلاطین کی ہستی کو خاک میں ملا دیا مگر دہقان[1] زادۂ طوس یعنی فردوسی کے چند شعر نہ مٹا سکا جو اس نے محمود کی ہجو میں کہے تھے۔ بقول فردوسی ؎

چو شاعر برنجد بگوید ہجا بماند ہجا تا قیامت بجا

پنڈت جی کی تاریخی نظر بہت وسیع اور بہت ہمہ گیر ہے۔ یہی نہیں کہ عربی وعجمی شعرا کے حالات ہی ان کے پیش نظر ہیں بلکہ ہندوستان کی ادبی تاریخ کا ہر ورق بھی ان کی نگاہوں کے سامنے ہے۔ چنانچہ اسی خطبے میں وہ ہندوستانی درباروں کی شاعر نوازی اور شعر فہمی پر ان لفظوں میں روشنی ڈالتے ہیں کہ :۔

"سلاطین مغلیہ کے عہد میں ایران کے بڑے بڑے شعرا اپنا وطن مالوف چھوڑ کر ہندوستان کھنچے ہوئے چلے آتے تھے اور اہل کمال نے ان سلاطین کے آستانے کو اپنا قبلۂ مراد قرار دے دیا تھا۔ مغل سلاطین خود ان شاعروں کو اپنے دربار کی زیب وزینت سمجھتے تھے اور ان کی قدر کرتے تھے"

ان تاریخی واقعات کے اعادے کے بعد آپ نے حقیقت شعر کے علمی موضوع کی طرف توجہ کی ہے۔ آپ کے اپنے الفاظ ہیں :۔

"صاحبو! میں نے شعر وشاعری کی عظمت اور شعراء کی قدر ومنزلت آپ کی خدمت میں عرض کی۔ اب میں شعر کی حقیقت مختصراً بیان کروں گا اور ایشیا اور یورپ کے اہل کمال کے جو خیالات شعر کی حقیقت کے بارے میں ہیں

---

[1] غزنوی شعراء نے ازراہِ تحقیر فردوسی کو یہی خطاب دیا تھا ۱۲

وہ سناؤں گا "

——— خطبے کا یہ حصّہ خاص طور پر پڑھنے کے قابل ہے۔ (کاش سننے کا موقع ملتا!) آپ نے ماہیت شعر کی وضاحت ارسطو کے بیان سے کی ہے جس کی غیرفانی کتاب "بوطیقا" فن شعر پر دنیا کی اہم ترین کتب میں شمار ہوتی ہے۔ ارسطو نے شعر کی جو تعریف کی ہے اُسے آپ نے بیان کیا ہے :-

"شعر ایک قسم کی نقالی یا مصوری کا نام ہے۔ فرق یہ ہے کہ مصور مادّی اشیاء کی تصویر کشی کرتا ہے اور شاعر ہر قسم کے جذبات و خیالات کی مصوری پر قادر ہے "

اس کے بعد آپ نے ادبی کتابوں میں شعر کی جو تعریف کی گئی ہے اس پر روشنی ڈالی ہے۔ یعنی :-

"وہ کلام جو متکلم نے بالارادہ موزوں کیا ہو "

——— پھر اس منطقی تعریف کی جرح و تعدیل کر کے نظامی عروضی سمرقندی کے خیالات پیش کیے ہیں۔ اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ جان اسٹوارٹ مل نے شعر کی جو تعریف کی ہے اس کا ایشیائی ناقدوں کی تعریف سے موازنہ کیا ہے اور اصل حقیقت اس طرح ظاہر کی ہے کہ :-

"شاعری کا دائرہ نہ تو اس قدر تنگ ہے جیسا مل صاحب نے بیان کیا ہے اور نہ اس قدر وسیع ہے جتنا علمائے عرب و عجم کی تعریف سے ظاہر ہوتا ہے بلکہ شعر کی ماہیت وہی ہے جو ارسطو نے بیان کی ہے یعنی جذبات انسانی اور مناظر قدرت کی تصویر کشی "

——— اس کے بعد پنڈت جی نے اصول بلاغت کی رو سے شعر کی تحلیل کی ہے اور بتلایا ہے کہ شعر دراصل شعور و احساس کا نام ہے لہٰذا شاعر وہی ہے جو احساسات و تاثرات کی صحیح اور قدرتی ترجمانی کر سکے۔ ماہیت شعر کے بیان کے بعد آپ نے اجزائے ترکیب شعر کا ذکر کیا ہے کہ شعر دو عناصر پر مشتمل ہے، مادّہ اور صورت، مادّہ

یعنی مضمون اور صورت یعنی ترکیب و بندش۔ اسی ضمن میں محاکات اور تخئیل پر عالمانہ تبصرہ کیا ہے اور محاکات اور مرقع نگاری کے درمیان جو فرق ہے اُسے واضح کیا ہے۔

مرقع نگاری کی مثالیں آپ نے سکندرنامے اور شاہنامے سے پیش کی ہیں اور فردوسی کے کمالات سخن کو جی کھول کے سراہا ہے اور یہ آپ کی سخن فہمی کی روشن دلیل ہے۔ پنڈت جی نے فردوسی اور نظامی کے درمیان ایک مرقع نگار اور فطرت شناس شاعر کی حیثیت سے جو فرق بیان کیا ہے اور جن قوی دلیلوں سے فردوسی کی عظمت سخن ظاہر کی ہے وہ موقع لاجواب ہے۔ یہ تمام چیزیں اگرچہ علامہ شبلی نے شعر العجم میں پوری تفصیل کے ساتھ پیش کی ہیں مگر دونوں میں حال وقال کا فرق ہے۔ پنڈت جی نے اُن تمام دلائل کو نئے انداز سے اپنے خطبے میں پیش کیا ہے اور جا بجا اپنی ذاتی بصیرت و اجتہاد سے کام لیا ہے۔ ہمارے پاس اتنی گنجائش نہیں کہ ہم تفصیل سے ان بحثوں کو دُہرا سکیں اور نہ شاید اس کی ضرورت ہی ہے۔ دکھانا صرف یہ ہے کہ پنڈت جی کے خطبات ادبی نقطۂ نظر سے کس قدر جامع اور تاریخی اعتبار سے کس قدر مکمل ہیں۔

پنڈت جی کی سخن شناسی کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اُردو شعرا میں ان کا محبوب انیس ہے۔ انھوں نے انیس کو ہر موقع پر بطور مثال پیش کیا ہے۔ انیس کی فطرت شناسی انیس کی واقعہ نگاری، انیس کی منظر کشی، انیس کی رفعت تخئیل، غرض انیس کی شاعری کے ہر ہر پہلو کو ہر ہر موقع پر بے نقاب کرتے ہیں اور اپنی ادبی صلاحیتوں کا شاندار ثبوت دیتے چلے جاتے ہیں۔ چنانچہ اس خطبے میں بھی آپ نے جا بجا انیس کے مرثیوں سے مثالیں دی ہیں اور ضمناً شہدائے کربلا کا اس طرح تذکرہ کیا ہے کہ ان کی تاریخی بصیرت اور معلومات پر بے ساختہ تحسین و آفریں کرنے کو جی چاہتا ہے۔ شعر کی ماہیت و ترکیب کے بیان اور مکمل بیان کے بعد ضمناً آپ نے ایشیائی شاعری پر اس اعتراض کا ذکر کیا ہے کہ

> "ایشیائی شاعری اخلاقی اور اصلاحی خیالات و مضامین سے تہی دامن ہے اور دور از کار باتوں سے بھری پڑی ہے"

—— اس اعتراض کا جواب پنڈت جی نے جس قابلیت اور وسیع النظری سے دیا ہے

وہ حصہ دیکھنے کے قابل ہے۔معترض کو یہ بتانے کے لیے کہ ایشیائی شاعری کا دامن اخلاقی موتیوں سے خالی نہیں ہے، پنڈت جی نے متعدد شعر پیش کیے ہیں اور پھر ان سے جو اخلاقی نتائج برآمد ہوتے ہیں، انھیں شمار کرایا ہے اور کہا ہے کہ:۔

"یہ کہنا غلط ہے کہ ایشیائی شاعروں نے اخلاقی مضامین نظم کرنے کی طرف توجہ نہیں کی۔گلستاں اور بوستاں ہی میں جتنے اخلاقی مسائل پیش کیے گئے ہیں ان کا شمار ناممکن ہے"

سلسلۂ بیاں کو نیا ربط دے کر آپ نے توارد، سرقہ، ترجمہ اور استنباط کے موضوع پر جو خیالات ظاہر کیے ہیں، ضرورت ہے کہ ہمارے نو آموز یا نوخیز شعرا انھیں غور سے پڑھیں اور اپنے لیے مشعل راہ بنائیں۔ اس بحث میں آپ نے ثابت کیا ہے کہ توارد شعرا کے درمیان ممکن ہے اور وہ عیب نہیں۔ البتہ خیالات کا سرقہ ہو یا لفظوں کی چوری یہ دونوں چیزیں ادبی دنیا میں بھی اتنا ہی بڑا گناہ ہیں جتنا قانونی دنیا میں۔ ہاں غیر زبانوں کے شعروں کا اپنی زبان میں ترجمہ کیا جا سکتا ہے، مگر خوبی یہ ہے کہ غیر زبان سے کوئی مضمون اگر اخذ کیا جائے تو ترقی کے ساتھ کہ اِس سے ادب مالامال ہوتا ہے۔لیکن اگر سلیقے اور اہتمام سے ترجمہ نہیں کیا گیا تو وہ ایک حرکت باطل اور فضول محض ہے۔ دوسرے کے مضامین کو خود سلیقے اور اہتمام کے ساتھ نظم کرنا بجائے خود ایک صنعت ہے۔ پنڈت جی نے اس صورت کو مستحسن قرار دیا ہے اور مثال میں سعدی کا ایک شعر پیش کیا ہے

ترا ہر آئنہ باید بہ شہر دیگر رفت — کہ دل نماند دریں شہر تا ستانی باز

—— پنڈت جی اس شعر کو پیش کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ:۔

"خسرو دہلوی نے دیکھا کہ مبالغہ تو بہت اچھا ہے مگر طریق ادا بہت بھدا اور بھونڈا ہے۔ عاشق کا محبوب کو یہ مشورہ دینا کہ تم اس شہر کو چھوڑ کو دوسرے شہر میں چلے جاؤ کیونکہ یہاں تمھاری دلبری کے لیے کوئی دل باقی نہیں رہا یہ ایک نازیبا سی بات ہے۔ لہذا انھوں نے اسی مضمون کو

ترقی دے کر شعر کو کہاں سے کہاں پہونچا دیا ؎

کسے نماند کہ دیگر بہ تیغ ناز کشی ‎ ‎ ‎ ‎ مگر کہ زندہ کنی خلق را و باز کشی

ایک دوسرے ادبی خطبے میں آپ نے نظم ونثر کے موضوع پر گلفشانی کی ہے اور بلیغ نکات پیدا کیے ہیں۔ فصاحت و بلاغت کا تذکرہ کرتے ہوئے آپ نے فصاحت کی تعریف ان لفظوں میں فرمائی ہے کہ:۔

"فصاحت کی تعریف یہ ہے کہ الفاظ سلیس، نرم، مانوس الاستعمال اور شیریں ہوں........ مثلاً یوں کہنا چاہیے کہ فصاحت سُر یا نغمے کا نام ہے، ہر سُر بجائے خود فصیح ہے لیکن اگر وہ ایسے سُر کے ساتھ ملا دیا جائے جو اُس سے میل نہیں کھاتا تو اجتماع ضدین سے دونوں سُر مکروہ ہو جائیں گے۔ الفاظ کا بھی یہی حال ہے کہ جو لفظ استعمال کیا جائے اس کے گرد و پیش ایسے متناسب اور موزوں الفاظ جمع کر دیے جائیں کہ وہ آپس میں میل کھا جائیں اور یہ دلیل کمال فصاحت کی ہے"

—— اس کے بعد میر انیس کے بعض مصرعے آپ نے مثال میں پیش کیے ہیں اور اس قابلیت سے ان کی خصوصیاتِ فصاحت کو واضح کیا ہے کہ ہر نکتہ ذہن نشین ہو جاتا ہے۔ میر انیس کے علاوہ قاآنی کا ایک شعر بھی دلیل میں لائے ہیں ؎

قصورش با فلک ہمسر، ہمہ خشتش زسیم و زر ‎ ‎ ‎ ‎ ملاطش نافۂ اذفر، حصاتش لولوئے لالا

—— پنڈت جی نے اس شعر کی جو فنی تحلیل کی ہے وہ ان کی ادبی بصیرت کا شاہکار ہے۔ اسی ضمن میں عجمی اور ہندوستانی شعراء کے فارسی کلام کا موازنہ کیا ہے اور بڑی دلچسپ مثالوں سے اپنے دعوے کو ثابت کیا ہے۔ عجمی اور ہندوستانی شاعری کا موازنہ کرتے ہوئے مشران مرحوم نے ایک فنی نکتہ پیدا کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ:۔

"بعض شاعر صنعتِ سجع میں غزل یا قصیدہ کہتے ہیں تو مطلع میں بھی وہی صنعت لے آتے ہیں۔ حالانکہ ظہوری کہتا ہے" باید مطلع از صنعت سجع عاری باشد" چنانچہ شعرائے فارس نے اس صنعت میں جس قدر قصائد لکھے ہیں

ان میں یہ التزام رکھا ہے لیکن ہندوستانی شعراء اس التزام کو نہیں برتتے اور یہ ان کی غلطی ہے "

پنڈت جی نے اس سلسلے میں متعدد مثالیں پیش کی ہیں۔ اس کے بعد بلاغت کی تعریف نقل کی ہے :۔

"صاحبو! بلاغت کی تعریف علماء نے اس قدر پیچ در پیچ کی ہے کہ (بعض نے) بلاغت کو نحو کا ایک جزو قرار دے دیا، حالانکہ ایسا نہیں ہے، بلاغت کا جزو اعظم ہے بلاغۃُ الکلامِ تطابقُ المقام، یعنی یہ کہ کلام حسب مقام ہو "

—— پھر بتلایا ہے کہ آخر علمائے معانی نے بلاغت کی یہ تعریف ناقص قرار دی اور اب بلاغت کا جزو فصاحت بھی قرار پایا۔ لیکن ہارون رشید عباسی کے عہد میں پھر اس تعریف پر اعتراض کیا گیا تھا۔ ہارون کا قول تھا :۔

"احسن الکلام ما قلّ و دلّ "

—— "اب بلاغت کی تعریف یہ قرار پائی۔ کلام حسب مقام ہو، کلام میں فصاحت ہو اور عبارت ما قلّ و دلّ ہو۔ یعنی الفاظ کم ہوں اور معنی وسیع ہوں"

—— اس کے بعد پنڈت جی نے بلیغ نثر کی مثالیں پیش کی ہیں اور سالار عساکر عباسیہ طاہر ذوالیمینین کی ایک عبارت نقل کی ہے اور پھر اس عبارت سے جو بلیغ نکات اخذ کیے ہیں، حق یہ ہے کہ حق ادا کر دیا ہے۔

یہی نہیں کہ اصول بلاغت کی تشریح میں آپ نے صرف نثر ہی کے نمونے پیش کیے ہوں بلکہ نظم کی طرف بھی توجہ کی ہے اور مقبل و انیس کے مراثی کے بعض ٹکڑے پیش کیے ہیں کہ نہ صرف موضوع پر مکمل روشنی پڑتی ہے بلکہ کلام میں غیر معمولی دلچسپی پیدا ہو گئی ہے۔

پنڈت جی کے خطبات میں بعض وقت افسانہ در افسانہ اور داستان پس داستان کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، جو بہت لطف دیتی ہے اور خطیب کی اصلی شان ہی

یہ ہے کہ وہ بات سے بات پیدا کرے۔ چنانچہ اسی خطبے میں فصاحت و بلاغت کی بحث کرتے کرتے انھوں نے فن انشاد (شعر خوانی) کے اصول و قواعد پر روشنی ڈالی ہے۔ اُردو ادب کے لیے یہ بحث شاید نئی ہے۔ فن تجوید و قرأت پر ہماری زبان میں اکثر کتابیں لکھی گئیں مگر فن شعر خوانی پر کوئی رسالہ موجود نہیں ہے۔ البتہ مرحوم حامد علی خاں صاحب امروہوی بار۔ ایٹ۔ لا نے اپنے سفرنامۂ انگلستان میں ضمنی طور پر اس فن کا تذکرہ کیا ہے اور انگلستان کے بعض ماہرین فن کے کمالات پر روشنی ڈالی ہے۔ پنڈت جی فرماتے ہیں کہ

"کوئی رسالہ اس وقت تک اس فن یا اس موضوع پر نہیں لکھا گیا۔ بہر حال میری نظر سے نہیں گزرا اور باوجود تلاش مجھے نہیں ملا۔ میں اس موضوع پر ایک رسالہ لکھ رہا ہوں جس کا نام فن شعر خوانی[1] ہوگا"

اس کے بعد پنڈت جی نے اس فن کے اصول بیان کیے ہیں اور چند شعر بطور مثال پیش کیے ہیں اور ان کی خواندگی اور قرأت کا طریقہ بتلایا ہے۔ مثلاً

نہال باغ علیّیں۔ بہار مرغزار دیں نسیم روضۂ یٰسیں۔ شمیم دوحۂ طاہا

اس شعر کی خواندگی کا آپ نے جو طریقہ بتلایا ہے۔ اُسے آپ کے ہی لفظوں میں سُنیے:۔

"مصرع اول میں نہال اور بہار پر اور مصرع ثانی میں نسیم روضہ اور شمیم دوحہ پر زور دینا چاہیے۔ جب یہ شعر اس طرح پڑھا جائے گا تو شعر کی خوبی دہ چند نہیں ہزار چند ہو جائے گی"

پنڈت جی نے خواندگی شعر کے عیوب ان لفظوں میں بیان کیے ہیں:۔

"یہ غلطی ہوتی ہے کہ ہائے ملفوظی کی جگہ مختفی اور مختفی کی جگہ ملفوظی پڑھتے ہیں

گدائے کہ بر خاطرش بند نیست بہ از بادشاہے کہ خرسند نیست

"بہ" کی "ہ" ملفوظ یا مظہرہ ہے اس کو یوں پڑھنا چاہیے کہ "بہ" کی (ہ) "از" کی (ز) میں مل کر آواز دے اور "از" کا (ا) گر جائے

[1] خدا معلوم یہ رسالہ مرتب ہوا یا نہیں بہر حال مرحوم کے کتب خانے میں دستیاب نہیں ہوا۔ البتہ پنڈت جی کا دوسرا رسالہ فن تذکیر و تانیث ملا ہے۔ اُمید ہے جلد اشاعت پذیر ہوگا۔

یعنی آواز نہ دے۔ الخ"

اسی طرح پنڈت جی نے قرأت شعر کو متعدد مثالوں سے ثابت کیا ہے اور خصوصیت سے یورپ کے اہل کمال کا ذکر کیا ہے۔ کہتے ہیں :۔

"پروفیسر ہارٹلے آکسفورڈ یونیورسٹی میں اس فن کے ماہر تھے۔ وہ جب شعر پڑھتے تھے تو خود شعر کی تصویر بن جاتے تھے۔ میرے خیال میں ہندوستان میں خدائے سخن میر انیس فن انشاد و خواندگی کے ماہر و امام تھے"

پنڈت جی ذوق سلیم اور مذاق صحیح کے مالک تھے۔ جہاں وہ ادبیات اُردو کے محاسن اور خوبیوں کو بتمام و کمال سمجھتے تھے وہاں وہ اس کے نقائص اور اسقام پر نکتہ چینی اور تنقید کرنے میں بھی دلیر تھے۔ آپ اپنے خطبے میں اُردو شعراء اور ادیبوں کو اس طرح مشورہ دیتے ہیں :۔

"اب وہ وقت آگیا ہے کہ نظم اُردو میں نئے نئے مفید اور بکار آمد مضامین دخل پائیں۔ قوم کو خواب غفلت سے بیدار کرنے والے خیالات، اس کو پستی زوال سے ابھار کر اوج کمال پر پہنچانے والے جذبات، قوم کی غیرت اور حمیت کی رگ کو حرکت دینے والے مضامین۔ اور نام و ننگ کے احساس کو برانگیختہ کرنے والے خیالات اگر نظم اُردو میں داخل کیے جائیں اور اس کے ساتھ آداب شاعری کا برتاؤ پورا پورا کیا جائے تو عام طبائع کے نزدیک پسندیدہ ہو اور ملک و قوم کے فروغ کا باعث ہو۔ اگر یہ ترمیم نظم اُردو میں ہو جائے (جو بالفعل ہو رہی ہے) تو پھر اُردو نظم کا مقابلہ دنیا میں کوئی دوسری نظم نہ کر سکے گی"

اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے کہ ایشیائی ادب میں الفاظ پر زیادہ زور دیا گیا ہے آپ فرماتے ہیں کہ :۔

"ایشیائی نظم کا پہلا اصول زبان سکھاتا ہے۔ آداب و اخلاق کے مضامین، جن کی کمی ہرگز نہیں ہے، ایسے پیرایے میں بیان کیے جاتے ہیں کہ لوازمات شاعری کا برتاؤ پورا پورا ہو جائے۔ جس سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ آداب شاعری سکھائے جائیں اور اصناف سخن پر عبور ہو۔ ردیف و قافیہ کی قید ایسا قافیہ تنگ

کرتی ہے کہ شاعر الفاظ کی تلاش میں حقیقت واقعہ سے دور جا پڑتا ہے ——
انگریزی نظم ہرگز زبان نہیں سکھاتی۔ نہ اس میں ردیف و قافیہ کی پابندی ہے۔
اسی وجہ سے اخلاق کا بیان نہایت سادہ اور دلنشین ہوتا ہے"
ہندوستانی اور فارسی شعراء کی پوزیشن ان لفظوں میں صاف کرتے ہیں کہ :۔
"شعرائے ہند و پارس میں بہت شاعر ایسے گزرے ہیں جنھوں نے تغزل میں بھی بیشتر آداب و اخلاق کے مضامین نہایت قابل قدر لکھے ہیں اور سیکڑوں مفید و بکار آمد مضمون باندھے ہیں۔ اور بایں ہمہ صفت شاعری کا پورا پورا برتاؤ کیا ہے"
اس کے بعد آسیر لکھنوی کے بہت سے شعر بطور استناد پیش کیے ہیں اور اپنے نظریے کو بدلائل واضحہ ثابت کیا ہے۔

مختصر یہ کہ پنڈت جی کا ادبی نظریہ، ان کی جامعیت تنقیدی، ان کی استعداد علمی اور ذوق کے شایان شان ہے۔ ان کے خطبات، لطیف ادبی نکتوں سے معمور ہیں۔ سب سے بڑی خوبی ان کی قوت تمثیل ہے۔ چونکہ ان کا تاریخی مطالعہ بہت وسیع اور ہمہ گیر تھا اس لیے وہ جس نکتے کو بیان کرتے تھے اس کے ثبوت میں صدہا تاریخی حکایات اور متقدمین کے اقوال نقل کردیتے تھے۔ وہ عربی، فارسی اور مغربی ادبیات سے کماحقہ آگاہ تھے اور اس منطقی ترتیب سے اپنے دلائل پیش کرتے تھے کہ قبول کرلینے کے سوا چارہ نہ تھا۔
—— یہ سب کیا تھا؟۔ درحقیقت یہ کرشمہ تھا اُس ماحول کا جس میں ہمارے علم دوست ہیرو نے آنکھیں کھولی تھیں۔ وہ ماحول جس میں، ہنود، اسلامی علوم، کمال رغبت سے حاصل کرتے تھے اور مسلمان ہندو ادبیات اور ہندو روایات سے غیر معمولی دلچسپی لیتے تھے۔ دونوں کی رسوم مشترک تھیں۔ دونوں کا فلسفہ مشترک تھا۔ من و تو کا امتیاز مٹ گیا تھا اور کامل اتحاد و اتفاق کا دَور دورہ تھا اور اُردو اس وحدت کاملہ کا مظہر تھی جس کے متعلق پنڈت جی نے کہا ہے کہ :۔

"اُردو مصلح قوم اکبر اعظم کا عطیہ اور ہندو مسلم اتحاد کی نشانی ہے"

ہم بیان کرچکے ہیں کہ پنڈت جی کا مجموعۂ خطبات ۱۵ خطبوں پر مشتمل ہے۔ جس میں ادبی خطبات تین ہیں۔ ادبی خطبات پر ہم ایک سرسری نظر گزشتہ سطور میں ڈال چکے ہیں۔

بقیہ خطبات میں چار خطبے خالص اسلامی مباحث پر ہیں۔ سیرۃ النبیؐ ، عید قرباں، علمائے اسلام کا شکریہ اور مصطفےٰ کمال کی فتح —— ہم ان خطبات پر آیندہ سطور میں روشنی ڈالیں گے۔ اسلامی خطبات کے علاوہ مذہبی رنگ کے چند خطبات اور ہیں۔ ان میں سے دو خطبے تھیاسوفی کے موضوع پر دو خطبے مسیحیت کے متعلق اور بقیہ رامائن اور دسہرے وغیرہ کے موضوع پر دیے گئے تھے۔ تھیاسوفی کے موضوع پر پنڈت جی نے جو کچھ کہا ہے وہ ان کے دلی خیالات کا عکس ہے کیونکہ تھیاسوفی (ویدانت یا تصوف) سے انھیں دلی لگاؤ تھا۔ ان کی زندگی کا نصب العین ایک شعر تھا ؎

کفرست در طریقت ما کینہ داشتن آئین ماست سینہ چو آئینہ داشتن

اور تھیاسوفی اِزم، صلحِ کل کا علمبردار ہے۔ لہٰذا پنڈت جی کو تھیاسوفی اِزم سے دلچسپی لینا ناگزیر تھا۔ اسلامی موضوعات پر پنڈت جی نے جو کچھ فرمایا ہے شاید ہی کوئی اسلامی خطیب اس پر کچھ اضافہ کر سکے۔ ہم نے مقدمے کی ابتدا میں ژان ژاک روسو کا ایک مقولہ نقل کیا تھا۔

"ادب انسانی تصور کو بلند تر اور ذہن و دماغ کو حقیر ترین تعصبات اور جانبداری کی گندگیوں سے پاک کرتا ہے الخ"

—— آپ خطبات سُران کو اس مقولے کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھیے۔ ان کے حرف حرف کو پڑھ جائیے۔ آپ کو حقیر ترین تعصبات کی گندگی اور امتیازات آئین و ملت کی آلودگی کہیں نظر نہ آئے گی۔ وہ یقیناً اُن لوگوں میں سے تھے جن کے متعلق کہنے والے نے کہا ہے کہ:۔

"اگر دنیا کی حکومت ادیبوں اور شاعروں کے ہاتھ میں دے دی جائے تو نہ کہیں مذہب کے نام پر لڑائیاں ہوں اور نہ وطنیت کے لیے خانہ جنگیاں"

—— واقعہ یہ ہے کہ پنڈت جی کا مذہب انسانیت اور عقیدہ بین الاقوامیت تھا۔ اس کا صحیح اندازہ ان کے اسلامی خطبات سے ہو سکتا ہے۔ موصوف یوم میلاد النبیؐ کے خطبے کا آغاز ان لفظوں سے فرماتے ہیں کہ:۔

"صاحبان ذیشان! آج کا روز دلفروز خود نوروز ہے اور یہ روزِ سعید بجائے خود یوم عید ہے۔ ہندو مسلم بھائیو! جناب پیغمبرؐ صاحب کے اوصاف حمیدہ

اور اخلاق پسندیدہ کا احصاء کرنا اس ضیق وقت میں محال بلکہ لاطائل خیال ہے۔ دریا کو کوزے میں بند کریں کیا مجال ہے۔ لہذا بطور مشتے از خروارے اور قطرہ از دریا بارے عرض کروں گا"

——— اور پھر اس مرصّع تمہید کے بعد بطور مشتے از خروارے آپ نے جو کچھ فرمایا ہے اس کی تعریف نہیں کی جا سکتی۔ کہیں سیرۃ رسولؐ پر فلسفیانہ حیثیت سے روشنی ڈالی ہے۔ کہیں جذبات عقیدت سے مجبور ہو کر نغمۂ نعت چھیڑ دیا ہے۔ کہیں تاریخی تبصرہ ہے تو کہیں اخلاقی نقطۂ نظر۔ الغرض یہ خطبہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے اور ہمارا خیال ہے کہ یہ اس بہترین لٹریچر میں شامل کرنے کے قابل ہے جو سیرۃ نگاروں نے سیرت رسولؐ پر دنیا کی کسی زبان میں مرتب کیا ہے۔

پنڈت جی اسلامیات کے بہترین عالم تھے اور آپ اسلامی تاریخ کے جزو و کُل سے باخبر تھے۔ ادبی خطبات میں کلام انیس پر بحث کرتے کرتے آپ نے واقعۂ کربلا کی جن تلمیحات کو بے نقاب کیا ہے وہ آپ کی وسعت نظر کا ثبوت ہے۔ آپ اپنے خطبات میں جابجا تاریخ اسلام کے اہم واقعات اور نمایاں شخصیتوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور ضروری نکات کی تشریح کرتے چلے جاتے ہیں۔ چنانچہ خطبات موسیقی میں، اسحاق موصلی، غریب (مغنیہ) ہاروں رشید اور معتز باللہ کے واقعات کا تذکرہ کیا ہے اور عہدِ عباسیہ میں فن موسیقی کی جو قدر و منزلت تھی اُسے سراہا ہے۔ ادبی خطبات میں عربی شعراء کے اثر و نفوذ پر بحث کی ہے۔ اس کے علاوہ علمائے اسلام پر جو خطبہ دیا ہے وہ اہم تاریخی معلومات سے لبریز ہے۔ آپ نے اپنے خطبوں میں ——— حجاج بغدادی، ابو حاتم رازی، ابو العلاء ہمدانی، ابو نصر فارابی، ابو العباس رازی، ابو البرکات، ابو الحسن طبیب، ابو بکر بن بشار اور عبداللہ اصفہانی کی شخصیتوں اور ان کی مصنفات کا سیر حاصل تذکرہ کیا ہے اور علمائے اسلام کی ادبی، طبی اور تحقیقی خدمات کی داد دی ہے۔

یہ کہنا کہ آپ عربی کے علامۂ اجل تھے، آپ کے کمالات علمی کے اظہار میں بخل کرنا ہے کیونکہ اس مجموعے کا ناظر اس حقیقت سے بے خبر نہیں رہ سکتا۔ البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ فارسی زبان پر آپ کو اسی قدر عبور حاصل تھا جتنا کہ کسی خالص ولایتی (عجم نژاد) کو ہو سکتا ہے۔ آپ ادبیات فارسی کی اُن فنی خوبیوں سے واقف تھے جن تک بہت کم نگاہیں پہونچتی ہیں۔

اس کا اندازہ ناممکن ہے کہ آپ کو اساتذۂ عرب و عجم کے کتنے منتخب اشعار حفظ تھے۔ نثر میں برمحل نظم کا استعمال کرنا بھی ایک فن ہے اور سپرو مرحوم بلاشبہ اس فن کے مجتہد تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایرانی شعراء میں فردوسی، سعدی اور میرزا حبیب قاآنی ان کے محبوب شاعر تھے اور اسی چیز سے ان کی سلامتی طبع اور صحت مذاق کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

یہاں تک موصوف کے جن خطبوں کا ذکر ہوا ان کے علاوہ بقیہ خطبات گو کہ اپنے موضوعات کے لحاظ سے مختلف اور رنگ رنگ ہیں لیکن زبان و بیان کی پاکیزگی، روانی اور سلاست و فصاحت کے اعتبار سے کسی کو کسی پر فوقیت نہیں دی جاسکتی۔ پنڈت جی کی زبان میں بلا کا لوچ ہے، غضب کی آمد ہے۔ وہ کہیں محاورہ بندی اور روزمرہ کا کمال دکھلاتے ہیں اور کہیں مسجع عبارت لکھتے ہیں۔ دونوں جگہ زبان کی گھلاوٹ اور قدرت کلام مزہ دیتی ہے۔

اس سلسلے میں اگر ان کے خطبات کے چیدہ چیدہ اقتباسات پیش کیے جائیں تو بحث کا دامن بہت وسیع ہو جائے گا اور وقت کی کمی اور فرصت کا اختصار اس کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ مختصر لفظوں میں یوں سمجھ لیجیے کہ ان کا ہر خطبہ اپنی جداگانہ ادبی اہمیت رکھتا ہے۔ وہ نہ صرف اپنے بیش بہا علمی مواد کے لحاظ سے اپنے مطالعے کی خاموش سفارش ہے بلکہ اپنے حسن ادا اور زبان و بیاں کے اعتبار سے بھی اپنی دلچسپی کی منہ بولتی شہادت ہے۔

تاریخی خطبات جو جنگ عظیم (۱۹۱۴ء) کے حوادث سے تعلق رکھتے ہیں وہ اپنے موضوع کی عظمت کے لحاظ سے ہماری خاص توجہ اپنی طرف مبذول کراتے ہیں اور جی چاہتا ہے کہ ان پر بہت کچھ لکھا جائے مگر ہم اس وقت صرف ان کا خاکہ پیش کر دینے پر اکتفا کریں گے تاکہ نکتہ رس ماہرین فن تاریخ اس خاکے کو پڑھ کر اندازہ کرلیں کہ مضموں نگار نے اس موضوع کے کسی بھی دقیق اور اہم پہلو کو نظر انداز نہیں کیا۔ یہ بتایا جاچکا ہے کہ پنڈت جی اپنی پبلک زندگی کی ابتدا میں ایک اعتدال پسند اور محتاط شخص تھے چنانچہ ان خطبات میں حرف حرف سے آپ کی معتدل و محتاط سیاست دانی کا پتہ چلتا ہے اور مضمون کی سب سے بڑی خوبی یہی ہوتی ہے کہ قائل کے دلی جذبات و احساسات کا آئینہ ہو۔ اس زمانے میں ہندوستانی سیاست جس نقطے پر تھی اس کے لحاظ سے لبرل ازم ہی مناسب تھا۔ ہر سہ خطبات کا

مجموعی خاکہ یہ ہے ۔

اوّل آپ نے جنگ عظیم کے تاریخی اسباب اور متحارب فریقین کے سیاسی روابط پر قیمتی روشنی ڈالی ہے، پھر سرویا، روس، آسٹریا، جرمن اور فرانس کے باہمی تعلقات، یورپ کی گزشتہ تاریخ، ریاستہائے بلقان کی سیاسی حالت اور جنگ عظیم کے اسبابِ ظہور پر عالمانہ بحث کی ہے اور یہ بتلایا ہے کہ کس طرح سرویا اور آسٹریا کی رقابت نے دوَل یورپ کو زندگی اور موت کی جد و جہد میں مبتلا کر دیا۔ ضمناً برطانیہ کی معدلت گستری اور انصاف پسندی کا شاندار لفظوں میں قصیدہ بھی پڑھا ہے ۔

—— پھر اتحادیوں کی اخلاقی برتری اور آسٹریا اور جرمن کی وحشیانہ حرکات کا مہیب افسانہ بیان کیا ہے اور واضح کیا ہے کہ آخری فتح کا دار و مدار گاڑُ زوری یعنی مادّی طاقت کے بیدردانہ استعمال پر نہیں ہوتا بلکہ اخلاقی طاقت پر ہوتا ہے ۔

آگے چل کر اتحادی فوجوں کی شاندار کامیابیوں کی تفصیل پیش کی ہے اور ترکی کی شرکت جنگ کو اسلامی مفاد کے لیے مضر بتایا ہے ۔ ترکی سیاست پر تبصرہ کرتے ہوئے پنڈت جی نے ترکی کی جرمن نوازی کے جو اسباب بیان کیے ہیں ان کی سچائی صرف آج کا مؤرخ ہی جان سکتا ہے جبکہ اس لڑائی کی ہر تفصیل منظر عام پر آچکی ہے ۔ اسی خطبے میں آپ نے ہندوستانیوں کی امداد جنگ کا تذکرہ کیا ہے اور بلجیم میں جرمن مظالم کی خوفناک روداد سنائی ہے ۔

—— آسٹریا، سرویا اور روس کی لڑائیوں کا تذکرہ کر کے ایک پختہ کار جنگی مبصر کی طرح محاذ جنگ کی مکمل ڈائری پیش کی ہے ۔

—— لکسمبرگ کے تاریخی حالات، بلجیم کی مختصر تاریخ اور دول یورپ کے باہمی عہدناموں کا ذکر کیا ہے اور ان تمام جزئیات کو بیان کر دیا ہے جو لیج، اینٹورپ اور بلجیم کے دوسرے جنگی مورچوں پر فوجی نقل و حرکت کے سلسلے میں پیش آئیں ۔ یہ تمام تفصیلات تاریخی قدر و قیمت رکھتی ہیں ۔

—— اس سلسلے کا آخری خطبہ وہ ہے جو دسمبر ۱۹۱۸ء میں آپ نے یوم فتح کے موقع پر ٹاؤن ہال (فرخ آباد) کے ایک جلسۂ تہنیت میں ارشاد فرمایا تھا ۔ اس خطبے میں آپ نے ہندوستانی خدمات کو

ان لفظوں میں گنایا ہے کہ :-

" ہمارے ملک ہندوستان کو یہ فخر حاصل ہوا کہ اس نے اس جنگ عظیم میں کافی حصّہ لیا - اس کی فوجوں نے ایشیا، یورپ اور افریقہ کی فوجوں کے سامنے بہادریاں دکھائیں اور داد شجاعت دی "

اس کے بعد آپ نے برطانوی مدبّرین کے وہ پیغام نقل کیے ہیں جو انھوں نے ہندوستانیوں کی امداد جنگ کے شکریے میں حکومت ہند کو ارسال کیے تھے اور اس چیز پر خوشی ظاہر کی تھی کہ بین الاقوامی صلح کانفرنس میں ہندوستان کو بھی اپنی نمائندگی کے لیے سر ایس، پی، سنہا کو بھیجنے کا استحقاق دیا گیا ہے -

اس تقریر کا خاتمہ ان لفظوں پر ہوتا ہے :-

" یا الٰہی! تو نے ہمارے وطن مالوف کو اس لڑائی کی آگ سے محفوظ رکھا اور اس موقع پر تو نے ہم کو برٹش قوم کے سایۂ عاطفت میں پناہ دی جس کی بدولت تمام دنیا کی تہذیب و آزادی برقرار رہی - یا الٰہی تو سالہا سال ہمارے شہنشاہ معظم کو تخت برطانیہ پر حکمراں اور تندرست و خوش و خرّم رکھ! "

ان خطبات سے پنڈت جی کی سیاسی زندگی کے ابتدائی رجحانات کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے -

غالباً اس چیز کے دوہرانے کی ضرورت نہیں ہے کہ جس زمانے میں مشران مرحوم نے یہ خیال ظاہر کیے تھے اُس وقت ہندوستان کا بڑے سے بڑا لیڈر اس سے زیادہ کچھ کہنے کا عادی نہ تھا - انتہا یہ ہے کہ مہاتما گاندھی بھی (جنھیں وائٹ ہال نے ۱۹۳۱ء میں باغی فقیر کا خطاب دیا تھا) گزشتہ جنگ عظیم کے موقع پر انہی لوگوں کی صف میں تھے جو مساعی جنگ سے کامل تعاون کر رہے تھے - لیکن جب لڑائی ۱۹۱۸ء میں حکومت برطانیہ کی عظیم الشان فتح پر ختم ہوئی اور وہ اُمید پوری ہونے کا وقت آیا جو دَورانِ جنگ میں ہندوستان کی سیاسی اصلاحات اور حقوق کے متعلق اہل ہندوستان کیے بیٹھے تھے تو صورت حال پلٹ گئی - ایتلاف ثلاثہ کی شکست اور ترکی کے زوال سے مشرق وسطیٰ میں نیا سیاسی نظام قائم ہوا، جس سے مسلمانان ہند کو سخت اندیشے پیدا ہو گئے - اُدھر عام ہندوستانیوں نے یہ محسوس کیا کہ مساعی جنگ کا انعام

انھیں نا امیدی، مایوسی اور حرماں نصیبی کی شکل میں ملا ہے تو ملک میں اس سرے سے اُس سرے تک بے اطمینانی، بے اعتمادی اور تشویش کی لہر دوڑ گئی اور ان تمام سرگرمیوں کا نتیجہ اُس شاندار تحریک کی شکل میں نکلا جسے ہم خلافت ایجی ٹیشن کہہ کر پکارتے ہیں۔ درحقیقت یہی وہ قومی حادثہ تھا جس نے ہندوستان کے سیاسی خیالات کے دھارے کو بدل دیا۔ مہاتما گاندھی نے ملک کو لاتعاون کا حربہ دیا اور ہندو مسلمان کے کامل اتحاد نے ہمارے قومی شعور کو کہیں سے کہیں پہونچا دیا۔

پنڈت جی ایک سچے قوم پرست اور پکے وطن دوست تھے۔ کیسے ممکن تھا کہ ان ہنگاموں سے ان کے دل و دماغ پر گہرے اثرات نہ پڑتے۔ چنانچہ اگست ۱۹۲۲ء میں انھوں نے مہاتما گاندھی کے یوم پیدائش (جنم دن) پر جو خطبہ دیا ہے اور اس میں جو خیالات ظاہر کیے ہیں ان کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ کیا یہی وہ شخص ہے جو خاتمۂ جنگ پر برطانی شہنشاہیت کا دُعاگو اور قصیدہ خواں تھا۔ مگر اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔ ۱۹۱۸ء سے ۱۹۲۱ء تک یعنی تین سال کی مختصر مدت میں ہندوستان کا سیاسی قافلہ کہیں سے کہیں جا پہونچا تھا اور پچھلے دَور کے ماڈریٹ، عہد نَو کے سب سے بڑے انقلابی بن گئے تھے ؎

طے میشود ایں رہ بدرخشیدن برقے   ما بیخبراں منتظر شمع و چراغیم

گاندھی جی کے جنم دن پر پنڈت جی نے جو خطبہ دیا ہے، اس میں پہلے ان کے خاندانی حالات بیان کیے ہیں اور پھر خود ان کے ابتدائی حالات کا تذکرہ کر کے ان کی وفائے عہد، سچائی اور دیانت کی تعریف کی ہے۔ اس کے بعد جنوبی افریقہ کے اُن حوادث کا خاکہ پیش کیا ہے جنھوں نے گاندھی جی کو ستیا گرہی بنایا۔ جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں پر جو مظالم ہوئے تھے ان کی طرف اشارے کیے ہیں اور ٹرانسوال میں گاندھی جی نے ہندوستانی آبادکاروں کے تحفظ حقوق کے لیے جو مہم شروع کی تھی اس پر نظر ڈالی ہے۔ اس کے بعد انھوں نے گاندھی جی کی اس امداد کا تذکرہ کیا ہے جو انھوں نے دَوران جنگ میں حکومت کو پیشکش کی۔ ان کے اپنے الفاظ ہیں:-

"جب یورپ کی جنگ چھڑی، اس وقت مہاتما گاندھی نے رنگروٹ بھرتی

کرانے میں بڑی مدد حکومت برطانیہ کو دی اور تمام ملک کو یہی ہدایت کرتے رہے چنانچہ ۲۲ لاکھ ہندوستانیوں نے اپنا خون پانی کی طرح بہا کر برطانیہ کے لیے فتح حاصل کی۔ لیکن جب مہاتما جی نے دیکھا کہ فتح کے بعد بھی ہندوستان کو مکمل آزادی حاصل نہیں ہوسکی بلکہ ڈومینین اسٹیٹس (یعنی درجہ نو آبادیات) بھی نصیب نہیں ہوا اور ہم ع

پھر آگئے اُسی مرکز پہ ہم جہاں سے چلے

کا سراسر مصداق ہو کر رہ گئے تب مہاتما جی نے نہایت مایوس ہو کر ترک موالات کی تحریک شروع کی"۔

—— ہم نے قصداً ان کے خطبے کا مذکورۂ بالا اقتباس پیش کیا ہے کیونکہ اگرچہ اس عبارت میں انھوں نے گاندھی جی کے زاویۂ نظر کی تبدیلی کے اسباب واضح کیے ہیں، مگر ان لفظوں میں ہم خود ان کے سیاسی خیالات کے محرکاتِ تغیر و انقلاب کو کارفرما پا رہے ہیں۔

—— اس کے بعد انھوں نے گاندھی جی کی عظیم شخصیت کے اخلاقی پہلوؤں کو بے نقاب کیا ہے اور ان کے فلسفۂ عدم تشدد اور نظریۂ لاتعاون کی تفسیر کی ہے۔

پنڈت جی کا دوسرا سیاسی خطبہ وہ ہے جو آپ نے فرخ آباد میں پنڈت موتی لال کی تقریب خیر مقدم میں ارشاد فرمایا تھا۔ اس خطبے کا آغاز آپ نے تلکؔ کے ایک مقولے سے کیا ہے۔

"سوراج میرا پیدائشی حق ہے اور میں اسے ضرور حاصل کروں گا"

—— اس کے بعد آپ نے پنڈت موتی لال کے ایثار و قربانی کا تذکرہ کیا ہے اور تحریک لاتعاون سے پنڈت جی کی زندگی میں جو انقلاب آگیا تھا اس کو اس شعر سے ظاہر کیا ہے کہ ؎

ادراکِ حال ما زنگہ می تواں نمود حرفے ز حالِ خویش بہ سیما نوشتہ ایم

—— پھر ہنٹر کمیشن کی تحقیقات کے سلسلے میں آنجہانی پنڈت موتی لال نے جو قربانیاں کی تھیں ان کی داد دی ہے اور قوم کو اس عظیم المرتبت انسان کے نقش قدم پر چلنے کی ہدایت

کی ہے۔ مشران مرحوم کے سیاسی خطبات کی پہلی کڑی وہ تقریر ہے جو آپ نے نومبر ۱۹۱۳ء میں بابو پرشوتم داس ٹنڈن (اسپیکر یو پی اسمبلی) کے مکان پر جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں کی تکالیف کے موضوع پر کی تھی۔ اس خطبے میں اگرچہ جذبات کی وہ تلخی نہیں ہے جو قدرۃً اس کے بعد عام ہندوستانیوں کے دل و دماغ میں پیدا ہو گئی تھی لیکن خیالات میں انقلابی رنگ جھلک رہا ہے اور پتہ چلتا ہے کہ پنڈت جی شروع ہی سے خالص قوم پرست اور نڈر طبیعت کے مالک تھے۔

—— اس خطبے میں انھوں نے گاندھی جی کی اُس تحریک کا ذکر کیا ہے جو انھوں نے جنوبی افریقہ کے ہندوستانی آباد کاروں کے حقوق و مطالبات کے حصول کے لیے شروع کی تھی اور پھر حکومت افریقہ کے مظالم کو بیان کیا ہے۔ ضمنی طور پر انھوں نے حکومت برطانیہ کی توجہ ملکۂ وکٹوریہ کے "میگنا چارٹا" (منشور آزادی) کی طرف مبذول کرائی ہے اور سختی کے ساتھ اُن قوانین کے خلاف احتجاج کیا ہے جو حکومت افریقہ نے ہندوستانیوں پر پابندیاں عائد کرنے کے لیے بنائے تھے۔

بہر حال پنڈت جی کے سیاسی خطبات سے ان کے قومی شعور کے درجہ بدرجہ ارتقاء کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔ شروع میں وہ لبرل عقائد رکھتے تھے، لیکن حالات نے آخر میں انھیں انتہا پسندوں کی صف میں لا کھڑا کیا اور ان کی زندگی اس شعر کی عملی تفسیر بن گئی ؎

وفا کیسی - کہاں کا عشق - جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگدل! تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو

اب ہم خطباتِ مُشران کا وہ اہم ترین وصف منظرِ عام پر لانا چاہتے ہیں جو نہ صرف ہماری نظر میں بلکہ حسن فطرت کے نباضوں کی نگاہ میں بھی جملہ خصوصیات کلام سے زیادہ مدح و ثنا کا مستحق ہے۔ کسی خطیب کے خطبات (یا شاعر کے کلام) پر نقد و نظر کرنے میں سب سے عجیب اور دلکش نکتہ جس پر خطبہ یا کلام کے مقبول یا غیر مقبول و مردود ہونے کا انحصار ہے، وہ ہے جو اہل بلاغت کی اصطلاح میں "مقتضائے حال کی مطابقت" سے تعبیر کیا جاتا ہے مگر علم النفس کے ماہرین اس کو "نفسیاتی مصوری" کے نام سے موسوم

کرتے ہیں۔ ہم اس بحث کو چھیڑنے سے پہلے اپنے مقالے کا ایک جزو مزید توضیح و تشریح کے ساتھ دوہرا دینا ضروری سمجھتے ہیں، جس کو سامنے رکھ کر ہم اپنے مقصد کو زیادہ کامیابی کے ساتھ واضح کرسکیں گے۔ اس مقالے کی ابتدا میں کہا جاچکا ہے کہ اگرچہ اظہار خیال و بیان مطالب کے اعتبار سے شاعر، مصنّف اور خطیب بظاہر ایک ہی صف میں آتے ہیں مگر شعرا و مصنفین، اظہار خیال و بیان مطالب کے وقت صرف اپنے نفس سے مخاطب ہوتے ہیں، ان کے روبرو کوئی مجمع نہیں ہوتا اور نہ اُن کو عوام کے نفسیات کا چنداں لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔ وہ لامحدود وقت اور بے پایاں فرصت کے مالک ہوتے ہیں۔ ممکن ہے کہ ایک ایک لفظ کی تہذیب و اصلاح پر وہ ایک ایک دن صرف کردیں یا ایک مطلب کو واضح کرنے کے لیے ہزاروں صفحات استعمال کر ڈالیں۔ شعرا اپنے موضوع نظم اور مصنفین اپنے نقطۂ بیان کے سلسلے میں بالکل آزاد ہوتے ہیں، مگر خطیب کو کسی قسم کی آزادی حاصل نہیں ہوتی۔ شاعر اور مصنّف کا مقام خلوت و عزلت ہے اور خطیب و مقرّر کی جگہ محفل و جلوت۔ خلوت و عزلت میں انسان کے ضمیر، خیال، اور قلم پر کوئی دباؤ نہیں ہوتا لیکن ہنگامۂ محفل اور گرمی جلوت کے وقت زبان کھولنا، مطالب کی دلنشینی برقرار رکھنا، محدود وقت کا بہترین استعمال کرنا، حاضرین کو درمیان میں جگہ جگہ تروتازہ کردینا، تقریر کی روانی میں، بیان کے بے کیف تعطل کو پاس نہ آنے دینا، موضوع پر قائم رہتے ہوئے مختلف مطالب سے ایسے نتائج استخراج کرنا جو موضوع بحث کو اور زیادہ قوت دیں، سننے والوں کو اُکتانے نہ دینا، بیان کے دوران میں جا بجا ظرافت کا رنگ پیدا کرنا، دلچسپ نکات و لطائف سے اپنے کلام کو رنگین و جاذب بنانا، اثنائے کلام میں موزوں اشعار و اقوال کی چست بندش کرنا، حاضرین کے خیالات و احساسات کے اُتار چڑھاؤ سے باخبر رہنا، تقریر کے اجزاء و عناصر کو منطقی مہارت سے جُدا جُدا کرنا اور پھر ہر جزو کی خصوصیات واضح کرنا، اُن سے نتیجہ نکالنا، ان کے باہمی روابط کو روشنی میں لانا، پھر ان منزلوں سے گزر کر اپنے موضوع کو ہاتھ لگانا اور سننے والوں کی کامل دماغی تائید حاصل کرنا، یہ ہیں ایک خطیب کے فرائض، جنھیں وہ چند منٹ یا چند گھنٹوں میں بیک وقت انجام دیتا ہے۔ گوکہ

ایک مصنف بھی اپنی تصنیف کو انہی چیزوں سے سنوارتا ہے اور ایک شاعر بھی اپنی نظم میں قریب قریب انہی قواعد کی پیروی کرتا ہے، لیکن وہی فرق، کہ شاعر و مصنف ایک نظم یا ایک مقالے کی ترتیب و تکمیل کے وقت کسی کے سامنے جوابدہ نہیں ہوتے۔ وہ اگر اپنی پوری عمر صرف ایک موضوع پر گزار دیں، جب بھی ان پر کوئی معترض نہیں ہو سکتا —— لیکن خطیب کو یہ سہولت کہاں نصیب۔ ایک خطیب اپنی تقریر میں کن کن مرحلوں سے گزرتا ہے یا اسے کن کن قواعد کی پیروی کرنا پڑتی ہے، اس پر بحث کرتے ہوئے علمائے منطق و کلام نے تقریر کو حسب ذیل تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

۱۔ تمہید۔ یعنی تقریر کا وہ ابتدائی حصہ جس میں وہ اپنے موضوع کی مبادیات واضح کرتا ہے اور حاضرین کو آیندہ تقریر کے لیے آمادہ کرتا ہے۔ اس حصے میں دلائل و براہین کی بھرمار نہیں ہوتی بلکہ ابتدا ہوتی ہے۔ خطیب سادہ لفظوں میں اپنے موضوع کلام کا تعارف کراتا ہے اور ان ضروریات کو واضح کرتا ہے جن کی بنا پر اس نے حاضرین کو اپنے گرد و پیش مجتمع کیا ہے۔ اکثر خطیب خطبے کی ابتدا میں اپنی ہیچمدانی اور ژولیدہ بیانی کا اعتراف بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ آگے چل کر تقریر میں کوئی خامی پیدا ہو جائے تو خطیب کا عجز و انکسار ان نقائص کا کفارہ بن کر سامعین کے تنغص کو دور کر دے۔ اس ہیچمدانی اور خاکساری کے ساتھ موضوع کی اہمیت و عظمت کا بھی پُر تاثیر لفظوں میں تذکرہ کیا جاتا ہے تاکہ سننے والوں کے دل میں مُقرر کے لیے جذبۂ ہمدردی اور موضوع کے لیے جذبۂ عظمت پیدا ہو جائے اور ان پر استعجاب و اشتیاق کی کیفیت طاری ہو جائے۔ زور بیان، طلاقت زبان اور جوہر ادا کے کمالات دکھلاتا ہے تاکہ یہ استعجاب و اشتیاق برابر بڑھتا رہے۔ ایک مُقرر کی کامیابی کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ وہ دوران کلام میں برابر اپنے سامعین کے جذبات شوق و حیرت میں اضافہ کرتا رہے تا اینکہ تقریر ختم ہو جائے اور نہ ان کا شعلۂ اشتیاق فرو ہو اور نہ حیرت و تعجب میں کمی آئے۔

۲۔ تمہید کے بعد گریز شروع ہوتی ہے۔ یعنی رجوع الی الموضوع۔ تقریر کا سب سے نازک اور اہم حصہ یہی ہے۔ خطیب کس طرح گریز کرتا ہے اور کس عمدگی اور بیساختگی سے اپنے

موضوع تک پہونچتا ہے، یہ تقریر اور خطبے کا ایک معرکۃ الآرا جزو ہے، جو آہستہ آہستہ کلام کو اپنے عروج و ارتقا تک پہونچا کر، حسنِ بیان کو دلائل و براہین سے مرصع کر دیتا ہے۔ جوں جوں تقریر اپنے ارتقائی مدارج طے کرتی جاتی ہے، مُقرِّر کے کلام میں جوش و خروش اور سامعین کے قلوب میں ذوق و شوق کی کیفیت پیدا ہوتی جاتی ہے۔ تقریر کا یہی حصّہ جانِ خطابت کہلاتا ہے۔ کسی خطیب کے کمالِ فن کو جانچنے کا ایک بہتر طریقہ یہی ہے کہ اس کی گریز کی لطافت اور رجوع الی الموضوع کی نزاکت کو دیکھا جائے۔

۳۔ خاتمہ ۔ ماہرینِ فن کا اتفاق ہے کہ کلام کی ابتدا جتنی شاندار ہوگی، اس کا مرکزی یا عروجی نقطہ، اتنا ہی دلچسپ اور جاذبِ توجہ ہوگا اور خاتمۂ کلام میں بھی وہ زور اور اثر پیدا ہو جائے گا کہ تقریر کے بعد بھی سامعین، لطافتِ کلام سے سیر نہ ہوں گے۔ خاتمۂ کلام پر تمام دلائل و براہین سمٹ کر کسی ایک نتیجے تک پہنچ جاتے ہیں اور موضوع واضح ہو جاتا ہے، لیکن اس موقع پر کمالِ خطابت یہ ہے کہ پایانِ تقریر میں اضمحلالی کیفیت اور افسردگی نہ پیدا ہو۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ تقریر کے آخری مراحل میں نہ صرف یہ کہ سننے والے اُکتا جاتے ہیں بلکہ بولنے والا بھی تھک جاتا ہے اور وہ ایسا محسوس کرتا ہے کہ اب کچھ کہنے کو باقی نہیں رہا، اس لیے جلدی جلدی نقطۂ آخر تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس عجلت و سراسیگی کے عالم میں بسا اوقات پوری تقریر بے لوچ ہو کر پھیکی پڑ جاتی ہے اور آغازِ تقریر نیز وسطِ تقریر کا تمام اثر و کیف مہمل ہو کر رہ جاتا ہے۔

اپنے ہیرو کی نفسیاتی نباضی کا کمال ظاہر کرنے کے لیے سطورِ بالا میں تمہیداً جو کچھ لکھا گیا، اس کے ساتھ یہ چیز بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جس طرح مختلف مضامین کے لیے شاعر یا مصنّف جداگانہ نوعیتوں کے اسلوب اور الگ الگ قسم کے محاورات و الفاظ انتخاب کرتا ہے، غزل کے الفاظ اور محاورات، نازک، نرم، سبک اور لچکیلے ہوتے ہیں، قصائد میں شکوہِ الفاظ اور عظمتِ تراکیب کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے، مرثیے کے لیے پرسوز الفاظ اور مانوس الحس محاورے استعمال کیے جاتے ہیں یا افسانوں کی زبان جداگانہ ہوتی ہے، تاریخی و علمی مضامین کا اسلوب کچھ اور ہوتا ہے، عورتوں اور بچّوں کے لیے جو لٹریچر تیار کیا جاتا ہے اُس کی بولی اور طرزِ بیان

بھی مختلف ہوتا ہے، پھر یہ بھی ضروری ہے کہ جس فن پر قلم اُٹھایا جائے اُسی کی مناسبات اور اصطلاحات استعمال کی جائیں، فن بلاغت کے یہ اصولی لوازم ہیں، جن سے قطع نظر نہیں کیا جا سکتا، ٹھیک اسی طرح خطیب کا بھی فرض ہے کہ وہ اپنے موضوع کے لحاظ سے لب کشائی کرے۔ جس فن پر وہ بحث کر رہا ہے اسی کے مناسبات و اصطلاحات سے، براعۃ الاستہلال و ایہام کے طور پر اپنے کلام کو سجائے اور ساتھ ہی ساتھ عوام کے مذاق اور معیار ذوق کو بھی پیش نظر رکھے۔ بزم میں فقط اہل نظر ہی نہیں ہوتے۔ تماشائی بھی ہوتے ہیں۔ بلکہ اہل نظر کی اقلیت ہوتی ہے اور تماشائیوں کی اکثریت۔ کمال خطابت یہ ہے کہ مُقرر دونوں کے مذاق کی تسکین کر سکے۔ مسئلہ زیر بحث کتنا ہی دقیق و پیچیدہ کیوں نہ ہو، طرز ادا اس درجہ سلیس، رواں، برجستہ اور دلچسپ ہونا چاہیے کہ عوام و خواص دونوں اس سے یکساں لطف اٹھائیں۔ آئیے اب متذکرہ فنی اصول اور نفسی رجحانات کی روشنی میں خطبات شروانی پر ایک نظر ڈالیں۔

جنوری ۱۹۳۳ء میں موصوف نے آل انڈیا موسیقی کانفرنس کی صدارت کے سلسلے میں جو خطبات ارشاد فرمائے تھے ان کے مطالعے سے ہمارا مقصد بخوبی واضح ہو جاتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ مرحوم، عوام کی نفسیات کو سمجھ کر اپنے موضوع کو شگفتہ و پر بہار بنانے کا کس قدر ملکہ رکھتے تھے۔ خطبۂ موسیقی کی ابتدا ایک رنگین نظم سے ہوتی ہے۔ موسیقی کو نظم سے فطرۃً جو لگاؤ ہے اس کے لحاظ سے یہ ابتدا کس قدر برمحل اور موزوں ہے۔ اس نظم کے چند شعر پڑھ کر دیکھیے اور غور کیجیے کہ موضوع موسیقی کی تمہید کے لیے اس سے بہتر الفاظ اور کہاں مل سکتے ہیں ؎

وہ بہار آئی۔ نوا سنج ہیں مرغانِ چمن — غیرتِ باغِ اِرم آج ہے صحنِ گلشن
جوش میں زمزمہ سنجی پہ ہیں مرغانِ بہار — کیا تعجب ہے کہ گویا ہو زبانِ سوسن
آبِ شبنم سے کہاں کاسۂ گل ہیں لبریز — جلترنگ آج بجانے کو ہے معشوقِ چمن

——— انصاف کیجیے کہ فن موسیقی سے تعلق رکھنے والے خطبے کی ابتدا میں ایک مترنم نظم کے ذریعے، مرغانِ چمن کی نوا سنجی، طیور بہار کی زمزمہ سرائی، زبان سوسن کی گویائی اور

معشوقِ چمن کے جلترنگ بجانے کا ذکر، کس قدر برمحل اور دلچسپ ہے اور سامعین کے احساساتِ نغمہ کو کس نزاکت اور لطافت سے بیدار کیا جا رہا ہے تاکہ وہ آیندہ موضوعِ تقریر سے پوری پوری دلچسپی لینے کے لیے مُقرر کے دمساز اور گوش اور بر آواز ہو جائیں۔

——اس کے بعد موصوف نے انسانی حواس کی لذت پذیری کے خواص کو واضح کیا ہے اور بتلایا ہے کہ حُسنِ صورت اور حُسنِ صوت (جنّتِ نظارہ اور فردوسِ گوش) کے اثرات دل و دماغ پر کیا ہوتے ہیں۔ پھر حُسنِ نغمہ و صوت کو رعنائیِ شکل و صورت پر ترجیح دی ہے۔ فرماتے ہیں۔

"حُسنِ ظاہر سے حظ نفسانی اور حُسنِ صوت سے لذتِ روحانی حاصل ہوتی ہے"

اپنے اس دعوے کے ثبوت میں سند کے طور پر یہ شعر پیش کیا ہے ؎

بہ از روے زیباست آوازِ خوش	کہ آں حظ نفس است و ایں قوتِ روح

——اس کے بعد نہایت رنگین و دلآویز پیرایے میں حسن صورت کے ساتھ خوش گلوئی اور خوش آوازی کی اہمیت پر زور دیا ہے اور فن موسیقی و کمال رقص کو حُسنِ ظاہر کی دلکشی اور دلربائی کا نقطۂ عروج و کمال بتلایا ہے، جو حقیقت اور رجحان نفس دونوں کے لحاظ سے مسلم الثبوت اور ناقابل تردید ہے۔

ہم نے کمالاتِ خطابت کی وضاحت کے سلسلے میں اس چیز پر خاص طور سے زور دیا تھا کہ عوام کے جذبات اور ان کے نفسیات کو تاریخی لطائف و ظرائف اور اقوال مشاہیر سے اُبھار کر تقریر کی کامیابی کے لیے سازگار ماحول پیدا کرنا، خطابت کی کامیابی کے لیے کس درجہ ضروری ہے۔ مُشران مرحوم اس گُر سے اچھی طرح واقف تھے۔ چنانچہ آپ اُن کے ہر خطبے میں، خطابیات کا یہ فنی کمال پوری طرح دیکھ سکتے ہیں۔ اسی خطبے میں حُسنِ صوت، خوش آوازی اور فن رقص کے امتزاج کی لطافتیں بیان کرتے ہوئے رامائن کی ایک روایت کو بطور مثال پیش فرماتے ہیں اور وہ نثر میں نہیں، نظم میں ؎

گئی بن میں وہ محبوبِ زمانہ	زباں پر تھا قیامت کا ترانہ

لباسِ پُرتکلف تن میں پہنے　　تنِ گلرنگ میں پھولوں کے گہنے
غرض گت ناچتی آئی جو بن میں　　بہار آئی ہر اک نخلِ کہن میں
یہ بھولے اپنی درویشی کا لٹکا　　تصور بندھ گیا ناگن سی لٹ، کا

——— یہ وہ موقع ہے جب مہاراجا دسرتھ نے اپنے دربار کی ایک اپسرا کو شنگی رکھ کے لانے کے لیے بن میں بھیجا ہے - شنگی رکھ ایک مشہور سادھو تھے - اُپسرا نے اپنے حسن و جمال کے افسوں اور رقص و موسیقی کے جادو سے شنگی رکھ کو تسخیر کر لیا - مُشران مرحوم نے اس واقعے کو حُسن و موسیقی کے بے پناہ کمالات کے ثبوت میں پیش کیا ہے اور اس سلسلے میں جو شعر سُنائے ہیں وہ منشی شنکر دیال صاحب فرحت کی منظوم رامائن کا ایک ٹکڑا ہیں -

——— اس کے بعد مُشران مرحوم نے خوش آوازی کی اہمیت پر زور دیا ہے اور فرمایا ہے کہ بجائے خود فن موسیقی ساز و بربط کی قید سے آزاد ہے - اگرچہ چنگ و رباب کی ہمسازی سے اس کا اثر ضرور بڑھ جاتا ہے مگر موسیقی اور ساز و مزامیر لازم و ملزوم نہیں، باایں ہمہ مزامیر کے بغیر نغمے میں محویت کی کیفیت نہیں پیدا ہوتی - موصوف اس بحث میں فرماتے ہیں :-

"گانے کے ساتھ طبلے کی تھاپ، بائیں کی گمک، مجیروں اور گھونگھروؤں کی جھنکار ضرور ہونا چاہیے - گانے کے ساتھ ساز بھی ہوں تو بعض وقت لَے بندھ جاتی ہے اور لطفِ نغمہ دوبالا ہو جاتا ہے"

——— اس کے بعد موصوف نے ایک ماہرِ فن کی طرح مختلف راگنیوں کے اوقات اور تاثرات کی طرف اشارہ کیا ہے اور ہندوستانی موسیقی کی بعض خصوصیات بیان کی ہیں - اسی سلسلے میں تال اور سُر نیز کلاسیکل موسیقی اور عوامی مذاق کا فرق بیان کیا ہے -

مُشران مرحوم کی یہ خصوصیت تھی کہ جب وہ کسی موضوع کو لیتے تھے تو اس کے باریک سے باریک جزئیات کو بھی بیان کر جاتے تھے - چنانچہ موسیقی سے تعلق رکھنے والے اس خطبے میں مشکل ہی سے انھوں نے کسی گوشے کو تشنۂ اظہار چھوڑا ہوگا - فن موسیقی کی اہمیت، ہندوستانی موسیقی، رقص و موسیقی کا باہمی ربط، راگنیوں کے اوقات، ہندوستانی موسیقاروں کے کمالات اور پھر اس ضمن میں موجودہ، نیز گزرے ہوئے بعض اربابِ کمال کا ذکر، عالمانہ تبحر اور

وسعتِ نظر کے ساتھ عربی موسیقاروں اور عہدِ عباسیہ کی فنی ترقیوں کا بیان فارسی مغنیوں (باربد ونگیسا) کے دوش بدوش اسحاق موصلی، ابراہیم اور مشہور عرب مغنیہ غریب کا تذکرہ اور پھر اموی اور عباسی خلفاء کی قدر دانی فن کے بعض واقعات، غرض موسیقی پر فنی اور تاریخی نقطۂ نظر سے مختصر وقت اور محدود پیرایۂ بیان میں عوام کی دلچسپی کو ملحوظ رکھتے ہوئے جو کچھ بھی بیان کیا جاسکتا ہے، وہ سب کچھ اپنے اس خطبے میں بیان کر دیا ہے۔ حقیقۃً کمال خطابت اسی کو کہتے ہیں۔ نشتران مرحوم اس بات کو اچھی طرح سمجھتے تھے کہ ؎

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادۂ و ساغر کہے بغیر

موضوعِ کلام کتنا ہی عالمانہ کیوں نہ ہو، مگر اندازِ بیان ایسا پرکیف و پُرتاثیر ہونا چاہیے کہ نظر بازوں اور نظر والوں کی تسکینِ مذاق کر سکے اور دونوں کے نفسی رجحانات کے مطابق ہو۔ کہنے میں یہ چیز جتنی آسان ہے کرنے میں اتنی ہی مشکل ہے۔ علمی تحقیق اور حکیمانہ مسائل کے بیان میں، زبان و بیان کی شگفتگی قائم رکھنا اور عوام کے نفسیات کے مطابق کلام کرنا، خداداد ذہانت رکھنے والے خطیبوں کا کام ہے۔ فنِ خطابت کی رو سے خطیب وہی ہے جو زورِ بیان اور حسنِ کلام پر قادر ہو، ورنہ بعض علمی مسائل کا بیان تو کسی آدمی کو خطیب بنانے کے لیے کافی نہیں۔ زیادہ سے زیادہ ہم اسے واعظ یا ذاکر کہہ سکتے ہیں، خطیب اور چیز ہے۔ خطیب کا مقصدِ اصلی صرف تحقیقِ علمی نہیں ہے بلکہ فنِ تقریر کا کمال بھی ہے۔ یوں سمجھیے کہ غایتِ خطابت خود خطابت ہے۔ پند و وعظ اور ذکر و فکر، بعد کی منزلیں ہیں۔ عربی خطباء محض اُسی شخص کو خطیب کہتے تھے جو سحرِ بیان اور جادوئے تقریر سے سامعین کو مسحور کرنے کی طاقت رکھتا ہو اور حقیقۃً خطیب ہے بھی وہی۔ فنِ خطابت، فنونِ لطیفہ کے شمار میں آتا ہے۔ یہ بھی موسیقی، مصوری اور شاعری کی طرح ایک وہبی ملکہ ہے جو قدرۃً انسان کو ودیعت ہوتا ہے۔ مشق و مزاولت سے مہارتِ کلام پیدا ہو سکتی ہے، مہارت کمال نہیں۔ دنیا میں جتنے مشہور خطیب گزرے ہیں سب قدرت کی طرف سے اس ملکہ کو لے کر آئے تھے۔ سحبان وائل وغیرہ اپنے کمالِ فن کے لیے کسی مشق و تعلیم کے شرمندۂ احسان نہ تھے۔ خطباتِ نشتران کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ نشتران مرحوم بھی مبدء فیاض سے یہ ملکۂ وہبی لے کر پیدا ہوئے تھے

البتہ مشق و مزاولت اور وسعت علم اور مطالعے نے اس شراب کو دو آتشہ اور اس ملکے کو دو چند کر دیا تھا۔

آپ پنڈت جی کے تمام خطبات پر شروع سے آخر تک ایک نظر ڈال جائیے اور پھر یہ غور کیجیے کہ یہ شخص کس طرح خطبے کا آغاز کرتا ہے، پھر آہستہ آہستہ کس طرح موضوع کو چھیڑتا ہے اور گریز کی نزاکت قائم رکھتے ہوئے نفس مضمون کو ہاتھ لگاتا ہے، درمیان میں دلچسپ اشعار سے کلام کو مزین اور بامزہ کرتا جاتا ہے، خاتمے کی طرف کس غیر محسوس طور پر رجوع کرتا ہے اور پھر اچانک کس طرح ختم کر دیتا ہے کہ طبیعت پر انقطاع بیان ذرا بار نہیں ہوتا، بلکہ اشتیاق کی آگ شعلہ زن رہتی ہے، نہ صرف یہ، بلکہ جس مسئلے پر بحث کرتا ہے اس کے مطابق، زبان میں کیا کیا تبدیلیاں پیدا ہو جاتی ہیں اور مسئلہ متعلقہ کی جزئیات اور نِشابات کس طرح واضح ہوتی چلی جاتی ہیں، تو آپ یہ اعتراف کیے بغیر نہ رہ سکیں گے کہ ؎

ایں سعادت بزور بازو نیست — تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

اب سے پچاس برس قبل یعنی فروری ۱۸۹۲ء میں پنڈت جی نے، آنریبل پنڈت اجودھیا ناتھ کنزرو وکیل ہائی کورٹ کی بے وقت وفات پر ایک تعزیتی تقریر کی تھی۔ اس تعزیتی تقریر کو پڑھنے کے بعد کون شخص ایسا ہوگا جو فاضل مُقرِّر کے انداز خطابت سے متاثر نہ ہو جائے۔ ملحوظ رکھیے کہ یہ ایک تعزیتی تقریر ہے، اس لیے پنڈت جی نے اس کی ابتدا ایک مرثیے سے کی ؎

ہر ایک گلشنِ عالم میں مُو پریشاں ہے — چمن میں سنبل تر زلف سوگواراں ہے
ہر ایک شاخ اُٹھائے ہے ہاتھ ماتم کا — ہر ایک نخل پہ بلبل بھی مرثیہ خواں ہے
چمن میں پہنے ہے سوسن بھی ماتمی پوشاک — برنگ دیدۂ تر نرگس آج گریاں ہے

رواں ز دیدۂ نرگس سرشک شبنم شد
فغاں کہ ہر شجرِ باغ نخل ماتم شد[1]

——ان پُرتاثیر اشعار کے بعد انھوں نے نثر میں اس طرح مرثیہ خوانی کی ہے:۔

"جس طرف دیکھیے حسرت و غم کے آثار نظر آتے ہیں۔ در و دیوار سے ماتم کی آواز آرہی ہے۔ ہر شخص کے چہرے پر حزن و ملال ہے۔ آسمان پر

---

[1] اتفاق سے اُس روز ابر فضائے سماوی میں محیط تھا ۱۲

ابر سیاہ کے ٹکڑے مجتمع ہیں کہ اشک ریزی کریں - آج دو پہر سے آسمان کی آنکھیں
اشک آلود نظر آتی ہیں - قریب ہے کہ فرطِ غم سے اس کے آنسو ٹپک پڑیں،
آپ لوگ خاموش ہیں اور سکتے کے عالم میں ہیں "

اس دردناک اور پُراز جذبات تمہید کے بعد وہ نفسِ مطلب کی طرف گریز کرتے ہیں - دیکھیے گریز کس قدر برمحل اور قدرتی ہے :-

" یہ خاموشی زبانِ حال سے کہہ رہی ہے کہ کسی بڑے ہر دلعزیز، حبیبِ وطن، بہی خواہِ ملک اور راستباز بزرگ کا ماتم ہے "

—— اس گریز کے بعد متوفی کا ذکر کیا ہے اور ان کے اوصاف و کمالات گنائے ہیں جو ہر شخص کے لیے ایک قابلِ تقلید نمونہ بن سکتے ہیں - مثلاً ان کی ایمانداری، حب الوطنی، عزمِ محکم، قوم پرستی اور راستبازی وغیرہ وغیرہ -

متوفی کا ذکر کرتے کرتے نثر میں نظم کی شان پیدا ہو گئی ہے - تاثیرِ بیان، منظر نگاری اور سامعین کے جذبات کو اُبھارنے کی ایک شاندار مثال حسبِ ذیل فقرات میں مل سکتی ہے - فرماتے ہیں اور کس درد سے فرماتے ہیں -

" صاحبو! اُس وقت (جب متوفی کی رسوم آخر ادا ہو رہی تھیں) عجیب عبرت انگیز سماں تھا - سب لوگ دیکھ رہے تھے کہ وہ جسم جو ملک کے قالب کے لیے روح رواں تھا، بے حس و حرکت پڑا ہے اور قریب ہے کہ آگ اس کو جلا کر خاک سیاہ کر دے "

آخری دیدارِ میت کی منظر کشی ان لفظوں میں کرتے ہیں :-

" تمام عزیزوں کا لاش کے گرد جمع ہونا، ستم رسیدہ بیوہ، مظلوم ماں اور چھوٹے چھوٹے بچوں کا گریۂ و زاری کرنا، سر دھننا، سینہ کوبی کرنا، یہ ایسا سماں تھا کہ خیال کرنے سے روئیں کھڑے ہو جاتے ہیں - ہر شخص کی یہ کیفیت تھی ؎

نہاں چہرہ در گردِ منظلومیئے ‎ ‎ ‎ ‎ ز مژگاں رواں اشک ہر دیدۂ

نہ از رنج کف ہا بسر می زنند   بسوئے عدم بال و پر می زنند

—— اس کے بعد متوفی کے وارثوں کو تسلّی وتشفی دینے کے لیے جو کلمات ارشاد کیے ہیں وہ دقتی تاثیر کے علاوہ حقیقت موت کے مشکل ترین فلسفے پر بھی روشنی ڈالتے ہیں اور خود ان کی شاندار موت پر پوری طرح صادق آتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

"موت حقیقت میں مادی جسم کو ہلاک کرسکتی ہے، نام نیک کو فنا نہیں کرسکتی۔ دولت وحشمت سب فانی چیزیں ہیں، مگر نام نیک ہمیشہ زندہ رہے گا ۔

قاروں ہلاک شد کہ چہل خانہ گنج داشت   نوشیرواں نہ مرد کہ نام نکو گزاشت

تمہید، گریز، نفس مطلب اور کلام کے عروجی نقطے سے گزر کر خاتمے کے چند لفظوں میں اپنے تمام جذبات تعزیت اس طرح سمو دیتے ہیں:۔

"صاحبو! اب فرط رنج والم، طول بیان سے مانع ہے اور طوالت کلام اس محل پر خلاف ادب بھی ہے، لہذا اپنے ماتمی بیان کو اس رزولیوشن پر ختم کرتا ہوں"

—— اس مختصر سے جلسے میں پنڈت جی نے تمام سامعین کے جذبات کو اپنا لیا ہے اور ختم بیان کرتے ہوئے اپنی تقریر کو سننے والوں کے تعزیتی احساسات کا مرقع بنا دیا ہے۔

خطبات سُرور کی ابتدائے تقریر، وسط کلام اور خاتمۂ بیان کو پیش نظر رکھتے ہوئے دعوے کے ساتھ یہ کہا جاسکتا ہے کہ پنڈت جی، تقریر کے آرٹ سے بخوبی واقف تھے، عوام کی نفسیات پر ان کی گہری نظر رہتی تھی، وہ دلوں کو تڑپانے اور دماغوں کے متحرک کرنے میں اپنی مثال آپ تھے، ان کی زبان میں لوچ تھا۔ لفظوں میں روانی تھی، نثر کو نظم سے سجاتے تھے اور نظم کو نثر سے تقویت دیتے تھے، دوران تقریر میں عوام کے معیار انتخاب کو مدنظر رکھتے تھے، یہی وجہ ہے کہ ان کے خطبات شروع سے آخر تک ایک عجیب قسم کی تاثیر اپنے حرف حرف میں رکھتے ہیں ۔

ہم نے سطور بالا میں ان کے خطبوں کے چند اقتباسات پیش کیے ہیں اور وہ بھی

بلا قصد و اہتمام کے۔ اگر بامعان مطالعہ کیا جائے تو ان کے ہر ایک خطبے میں یہی خصوصیات کم و بیش نظر آتی ہیں۔ پنڈت جی کا ہر خطبہ نظم و نثر کا ایک دلکش مجموعہ ہوتا ہے۔ انتخاب شعر اور پھر نثر کی روانی میں پسندیدہ اشعار کا برمحل استعمال بہت مشکل فن ہے۔ اس کے لیے زبردست حافظہ، غیر معمولی ذوق سخن اور برمحل یادداشت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہم پنڈت جی کے ذوق سخن کا لوہا مانے بغیر نہیں رہ سکتے کہ مرحوم نے نثری فقرات میں شعروں کو اس طرح کھپایا ہے کہ نثر سئے دوآتشہ کا مزہ دیتی ہے اور لطف یہ ہے کہ وہ مثال میں معمولی اشعار پیش نہیں فرماتے بلکہ اساتذہ عرب وعجم اور ہندوستان کے مشاہیر شعراء کا، اعلیٰ درجے کا کلام ان کی زبان پر ہے اور وہ بے تامل اسے استعمال کرتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ہمیں جابجا انگریزی شعراء کے حوالے بھی نظر آتے ہیں۔

پنڈت جی، عامیانہ اور پیش پا افتادہ مضامین میں اپنے زور تخیل اور حسن بیان سے ایسی جدت پیدا کر دیتے ہیں کہ خاص و عام اس سے مزہ لیتے ہیں۔ ایک الوداعی خطبے میں اپنی ہیچمدانی اور اپنے پیشرو مقررین کی عظمت کا اعتراف (جو کہ ایک فرسودہ مضمون ہے) اس طرح کرتے ہیں:۔

"ان فصیح و بلیغ مضامین کے بعد جو آپ سن چکے ہیں، میں خیال کرتا ہوں کہ میرے لیے زیادہ کہنے کی گنجائش باقی نہیں رہی ہے ؎

حریفاں بادہ ہا خوردند و رفتند   تہی خم خانہ ہا کردند و رفتند

میں اپنے خیالات کو شاید اس خوبی سے ظاہر نہ کر سکوں، جس خوبی سے میرے دوستوں نے ظاہر فرمائے ہیں کیونکہ میں فصاحت میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ پھر سوچتا ہوں کہ چڑیا اگرچہ شاہباز کا مقابلہ نہیں کر سکتی تاہم چار و ناچار اسے اڑنا ہی پڑتا ہے ؎

دانم نہ رسد ذرہ بخورشید و لیکن   شوق طیراں می کشد ارباب ہمم را

ایک اور وداعیہ خطبے میں اپنے ممدوح کے لیے جو مدحیہ اور دعائیہ کلمات ارشاد فرمائے ہیں اُن کو ناظرین کی ضیافت طبع کے لیے پیش کرنا خالی از لذت نہ ہوگا کیونکہ ان میں

جدت پسندی اور حق پسندی، جو کہ بظاہر ضدین ہیں، پہلو بہ پہلو نظر آتی ہیں۔ فرماتے ہیں:-

"میں خاقانی یا انوری نہیں ہوں کہ ثنا یا دعا میں شاعرانہ مبالغہ کروں۔ میں یہ نہ کہوں گا کہ آپ فیاضی میں ابرنیساں یا ایثار و کرم میں حاتمِ دوراں ہیں۔ میں نہ کہوں گا کہ آپ کی عمر ہزار برس کی ہو —— یہ کہوں گا کہ جب تک آپ اس دارِ فانی میں زندہ رہیں، باکام و بامراد زندگی بسر کریں۔"

مختصر یہ ہے کہ جدتِ ادا، حسنِ بیان، لطفِ زبان، ادبی چاشنی، علمی عظمت، روانی، چستی بندش، نُدرتِ تراکیب، معانی و مطالب کی تسہیل اور سب سے بڑھ کر عوام کے نفسیات سے لگاؤ، ان خطبات کی نمایاں خصوصیات ہیں، جن کی توضیح و تشریح کے لیے ہم نے جستہ جستہ اقتباسات پیش کیے ہیں جن کے مطالعے سے خطیب کی ذکاوت اور ذہانت کا کسی نہ کسی حد تک اندازہ ضرور ہو سکتا ہے۔ اس موضوع پر ابھی بہت کچھ کہنے سننے کی گنجائش ہے لیکن قارئین پر ظلم ہو گا کہ انھیں دیر تک پنڈت جی کے خطبات سے محروم رکھا جائے اور تمہید کو اس قدر طول دیا جائے کہ اہلِ محفل اُکتا جائیں ع کہ نغمہ نازک و اصحاب پنبہ در گوش اند —— البتہ اتنا بتلا دینا غیر ضروری نہ ہو گا کہ پنڈت جی کی جامعیتِ علمی اور خطابیاتی عظمت کو ان ہی چند خطبوں میں محدود نہیں کیا جا سکتا۔ اس مجموعے میں ۵۱ خطبے شامل ہیں اور ہم سمجھتے ہیں کہ ع جو ذرہ جس مقام پہ ہے آفتاب ہے —— یقیناً خطباتِ مُشران کی اشاعت سے ادبِ اُردو میں ایک گرانقدر اضافہ ہو رہا ہے جس کی اشاعت کے لیے ہم مرحوم کے خلف الرشید پنڈت جگموہن نراین صاحب مُشران، سابق ڈسٹرکٹ جج کے مرہونِ منت ہیں کہ موصوف کے علمی شوق نے اس نگارخانۂ سخن کو منظرِ وجود پر آراستہ کیا ؎

تو پندار کہ ایں نغمہ ز خود می گویم
گوش نزدیک لبم آر کہ آواز من است

ناچیز نسیم امروہوی

خُطبات

شعراء کا خیر مقدم

اور

شاعری پر بصیرت افروز تبصرہ

بھارتی پاٹھشالا فرخ آباد کی نمائش کے سلسلے میں حسب دستور ایک بزم شاعرہ منعقد ہوئی، جس کی مسند صدارت پر جناب منشی نصیرالدین صاحب علوی (منصف مین پوری) جلوہ افروز تھے اور مُشران صاحب استقبالیہ کمیٹی کے صدر تھے۔ موصوف نے اس جلسے میں شعراء و سامعین کا شکریہ ادا کرنے کے بعد شعر و سخن پر حسب ذیل عالمانہ اور محققانہ خطبہ ارشاد فرمایا۔ یہ خطبہ درحقیقت موصوف کا علمی و ادبی شاہکار ہے۔

میر مجلس اور حضرات انجمن!

مجھے یہ خدمت سپرد ہوئی ہے کہ میں بطور صدر استقبالیہ کمیٹی کے آپ صاحبوں کا خیر مقدم کروں۔ پہلے مجھے کمیٹی کا شکریہ اپنی طرف سے ادا کرنا چاہیے کہ مجھے اس خدمت کے واسطے انتخاب فرمایا۔ ع منت شناس ازاد کہ بخدمت بداشتت۔ کاش یہ کام کمیٹی کسی شاعر کے سپرد کرتی جو نظم میں یا شگفتہ نثر میں آپ کا شکریہ

ادا کرتا! بخلاف اس کے یہ خدمت ایک شخص غیر شاعر کو تفویض کی گئی ہے، جو ٹوٹی پھوٹی نثر میں آپ کا خیر مقدم کرے گا۔

میں استقبالیہ کمیٹی کی طرف سے تمام ارباب سخن کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے اس بزم سخن کو رونق تازہ اور زینت بے اندازہ بخشی ہے۔ جو اصحاب دور سے تشریف لائے ہیں وہ خاص طور پر ہمارے شکریے کے مستحق ہیں۔ ہم سب کو جناب صدر مشاعرہ اور میزبان مہرباں کا شکریہ نہایت گرمجوشی سے ادا کرنا چاہیے، جن کی صدارت اور رہنمائی سے اور جن کی مہمانداری اور خوش انتظامی سے یہ بزم سخن آراستہ و پیراستہ ہوئی ہے۔ آپ دونوں صاحبوں کا اخلاق عمیم اور اُس کا جذب مقناطیسی ہے جو ہم سب کو یہاں کھینچ لایا ہے۔

صاحبان والاشان! اب مشاعرے کی طرف لوگوں کا ذوق بڑھتا جاتا ہے۔ کسی تقریب سے کوئی انجمن کیوں نہ ہو وہ مشاعرے پر ختم ہوتی ہے۔ جیسے لوگوں کو عمدہ کھانے کھلائے جائیں اور بعد میں اور لذیذ میوے انواع و اقسام کے میز پر چُننے جائیں تو باوجودیکہ لوگ سیر ہو چکے ہیں تاہم اُن لذیذ میووں کو نہایت شوق سے کھاتے ہیں، یہی حال مشاعرے کا اہل ذوق کے ساتھ ہے کہ باوجودیکہ پہلی تقریبوں اور جلسوں کا لطف اُٹھا چکے ہیں لیکن آخر میں بزم مشاعرہ میں نہایت شوق سے شریک ہوتے ہیں اور اس کا لطف علیحدہ حاصل کرتے ہیں۔

صاحبان ذیشان! مجھ سے میرے دوستوں نے یہ فرمائش کی ہے کہ شکریے کی تقریر کے ساتھ شعر و سخن کے موضوع پر بھی کچھ بیان کرنا چاہیے۔ اگر میں تعمیل نہ کروں تو وہی بات ہوگی کہ "آزردن دل دوستاں جہل ست"۔

میں اس وقت فصاحت و بلاغت کے موضوع پر کچھ عرض کروں گا اور فن شعرخوانی کے کچھ اصول بھی بیان کروں گا۔ یہ سب موضوع بزم مشاعرہ سے تعلق خاص رکھتے ہیں۔ میں بہت خوشی سے دیکھتا ہوں کہ طلبہ کی جماعت بھی یہاں موجود ہے جو مشق سخن کرنے والے ہیں۔ ان کو بہت ضرورت ہے کہ شاعری کے آداب سیکھیں، اگر شاعر بننا چاہتے ہیں۔ یہ ابھی نوآموز ہیں، میں ان کی خاطر بھی ملحوظ رکھوں گا اور ایسی باتیں عرض کروں گا جو ان کے سمجھنے اور غور کرنے اور عمل کرنے کے قابل ہوں گی۔ ان کو بہت سوچ سمجھ کر اس میدان میں قدم رکھنا چاہیے:۔

ع کاندریں راہ خارہا باشد

ان کو بھی وہی آداب و قواعد سیکھنا چاہیے، جو فصحاء کے نزدیک مسلّمات سے ہیں۔

میں پہلے فصاحت کا ذکر کروں گا۔ فصاحت کی تعریف یہ ہے کہ الفاظ سادہ، سلیس، نرم، مانوس الاستعمال اور شیریں ہوں۔ غریب و ثقیل اور قلیل الاستعمال لفظوں سے پرہیز کیا جائے، باہم الفاظ میں تنافُر نہ ہو۔ اگر کوئی لفظ غریب یا ثقیل آجائے تو اس ترکیب سے استعمال ہو کہ اس کی غرابت یا ثقالت جاتی رہے۔ یوں کہنا چاہیے کہ فصاحت سُر یا نغمے کا نام ہے۔ ہر سُر بجائے خود فصیح ہے، لیکن اگر وہ ایسے سُر کے ساتھ ملا دیا جائے جو اُس سے میل نہیں کھاتا تو اجتماع ضدّین سے دونوں سُر مکروہ ہو جائیں گے اور نغمہ بگڑ جائے گا۔ کہیں ضرورت ہے کہ گندھار سُر، الاپا جائے اور مغنّی وہاں کوئی

دوسرا سُر پنچم، دھیوت، نکھاد، رکھب وغیرہ شروع کردے تو نغمہ بگڑ جائے گا۔ یہی حال الفاظ کا ہے۔ لازم ہے کہ جو لفظ استعمال کیا جائے اُس کے گرد و پیش کے الفاظ کو اُس کے ساتھ ایک قسم کا تناسُب یا توازُن ہو ورنہ فصاحت قائم نہ رہے گی۔ ایک مصرع لیجیے ع۔ جنگل کے شیر گونج رہے ہیں کچھار میں۔ جنگل، دشت، صحرا اور بادیہ سب مرادفات ہیں، لیکن اگر مصرع مذکور میں بجائے جنگل کے صحرا کہیں تو فصاحت کا خون ہو جائے گا۔ حالانکہ چاروں الفاظ مذکورہ بالا سب بجائے خود یکساں فصیح ہیں، اور کثیر الاستعمال بھی ہیں۔ اسی طرح اس مصرع میں کہ ع "تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا"۔ بجائے صحرا کے جنگل کا لفظ نہیں آسکتا اور مُخلِ فصاحت ہے۔ دامن دشت، دامن بادیہ، روزمرہ کے خلاف ہے۔ قاآنی نے اپنے ایک شعر میں قلیل الاستعمال لفظ نظم کیے ہیں، مگر ثقالت و غرابت محسوس نہیں ہوتی۔ اوّل چند الفاظ کی تشریح سُن لیجیے پھر شعر عرض کروں گا۔ قصر کی جمع قصور صحیح ہے، لیکن کثرت سے استعمال نہیں ہوتی۔ فارسی میں قصور بمعنی فروگزاشت یا کمی اکثر استعمال ہوا ہے۔ جیسے حور، دوراز قصور۔ اسی طرح ملاط بمعنی گارا اور حصاۃ بمعنی سنگریزہ یا روڑا۔ شاعر کہتا ہے۔ ؎

قصورش با فلک ہمسر، ہمہ خشتش ز سیم و زر ملاطش نافۂ از فر، حصاتش لولوئے لالا

غور کیجیے، قصور کے بعد الفاظِ "با فلک ہمسر" کو سُن کر سامع سمجھ لے گا کہ یہاں قصور بمعنی خطا نہیں ہے کیونکہ الفاظِ "با فلک ہمسر" موجود ہیں۔ اسی طرح روڑے اور گارے کی مناسبت سے اینٹ کا لفظ لکھ دیا کہ ایک قسم کا تناسُب یا

توازن ہو جائے۔ گارے کو نافے سے اور سنگریزوں کو موتیوں سے تشبیہ دے کر بھی غرابت اور ثقالت کو کم کر دیا۔

فصاحت کے تحت میں مطلع کا حال عرض کروں۔ اکثر شاعر نہیں جانتے کہ مطلع میں کیا ہونا چاہیے اور کیا نہ ہونا چاہیے۔ اکثر اچھے شاعروں سے بعض دفعہ چوک ہو جاتی ہے۔ واضح ہو کہ مطلع میں بہت سلیس اور فصیح الفاظ جو روزمرہ میں داخل ہیں استعمال ہونا چاہیے اور ثقیل اور قلیل الاستعمال اور دقیق الفاظ سے پرہیز کرنا چاہیے۔ نواب کلب علی خاں والی رامپور اچھے فارسی گو تھے اور ذی علم بھی، اُنھوں نے اپنی غزل کا مطلع کہا ہے ؎

نہ باشد چوں منے در ملک ہستی کامل و یکتا　　　لئیق دا زکی وارشد طلیق و عاقل و دانا

مشہور شاعر سنجر شیرازی جو میرزا سپہر لسان الملک کا شاگرد رشید تھا، اُس وقت بریلی اور مُراد آباد کی سیر و سیاحت کر رہا تھا۔ اُس کے ہاتھ یہ غزل کسی طرح لگ گئی۔ اُس نے اس غزل کے ایک ایک مصرع میں اصلاح دی اور ایسی اصلاح دی کہ باید و شاید۔ اُس نے یہ استدلال کیا کہ ہندیوں کے لہجے میں واوِ مجہول اور یائے مجہول ہے، لیکن ایرانیوں کے لہجے میں معروف ہے، مجہول قطعی نہیں۔ لہٰذا گو ہندی لہجے میں "منے" کی یا کا لہجہ مجہول کیا جائے گا، مگر ایرانی اُس کو یائے معروف ہی پڑھیں گے۔ پس 'منی' کا لفظ اکراہ پیدا کرے گا۔ کیونکہ قرینہ دوسرے معنی کا موجود نہیں ہے۔ البتہ خسرو اقلیم سخن سعدی نے کہا ہے ؎

مر اُو را رسد کبریا و منی　　　کہ ملکش قدیم ست و ذاتش غنی

کبریا کے بعد واو عاطفہ موجود ہونے سے دوسرے معنی کا قرینہ صاف ہے۔
پس یہ مصرع نواب کو یوں کہنا چاہیے تھا۔ ع

نباشد ہمچو من در ملک دانش کامل و یکتا

اسی طرح دوسرا مصرع الفاظ غریب و ثقیل کو شامل ہے۔ یوں بدلنا چاہیے۔

فصیح و خوش بیان و بذلہ سنج و عاقل و دانا

چونکہ میں مطلع کا بیان کر رہا ہوں اس لیے یہ عرض کرنا بیجا نہ ہوگا کہ بعض شاعر صنعت سجع میں غزل یا قصیدہ کہتے ہیں تو مطلع میں بھی صنعت لے آتے ہیں۔ حالانکہ ظہوری کہتا ہے۔ "باید کہ مطلع از صنعت سجع عاری باشد" ہمپایۂ انوری و خاقانی میرزا حبیب اللہ قاآنی (ملک الشعرائے فتح علی شاہ قاجار والی ایران) نے صنعت سجع میں ایک لاجواب قصیدہ کہا ہے، جو کسی وقت بی، اے کے کورس میں داخل تھا۔ اس کا مطلع صنعت سجع سے عاری ہے ؎

بگردوں تیرہ ابرے بامداداں برشد از دریا جواہر خیز و گوہر ریز و گوہر بیز و گوہر زا

اور بھی بیسوں شعرائے عجم نے اس زمین میں طبع آزمائی کی ہے۔ سبھوں نے مطلع کو صنعت سجع سے عاری رکھا ہے۔ میرزا سپہر لسان الملک ملک الشعرا کہتا ہے ؎

چہ سودا در سر افتادم کہ نے سر ماند و نے سودا چہ طوفاں گند بنیادم کہ ہم شد کلبہ ہم کالا

میرزا فتح علی خاں صبائے کاشانی کہتا ہے ؎

بناز اے تخت اسکندر ببال اے مسند دارا کہ شد اسکندر دیگر بدارائی سریر آرا

میرزا فضل اللہ خاور شیرازی کہتا ہے ؎

ہمو مینا ہمو ساقی ہمو ساغر ہمو صہبا خمار از اوست در سرہا نشاط از اوست در دلہا

ملاحظہ کیجیے، سب کا مطلع صنعت سجع سے عاری ہے حالانکہ یہ نظمیں تمام و کمال صنعت سجع میں ہیں - ایک ہندی شاعر نے جس کی غزل بلکہ نظم مثل اہل عجم کے گرانمایہ ہے، صنعت سجع میں قصیدہ کہا ہے لیکن مطلع کو صنعت مذکور سے عاری نہیں رکھا - یہ بمقتضائے بشریت تھا یا ممکن ہے کہ ہندی نژاد ہونے کا نتیجہ تھا - کیونکہ ع "زبان غیر کیا، آتی نہیں اپنی زباں برسوں" وہ کہتا ہے ؎

چہ بستانے مشام آرا طرب انگیز روح افزا گزشتم بوستانے را شبے در عالم رویا

اب میں بلاغت کا ذکر کروں گا -

صاحبو! بلاغت کی تعریف علمائے معانی نے اس قدر پیچ در پیچ کی ہے کہ بلاغت کو نحو کا ایک جزو قرار دے دیا، حالانکہ ایسا نہیں ہے - میں آپ کے روبرو بلاغت کی تعریف اس طرح کروں گا کہ سب کے ذہن پر مرتسم ہو جائے اور جو کچھ فصحا نے لکھا ہے اس کا لب لباب ہو - جب اول اول بلاغت کے اصول مدوّن کیے گئے تو واضع نے بلاغت کا جزو اعظم یہ قرار دیا کہ "بلاغتُ الکلام تطابقُ المقام" یعنی یہ کہ کلام حسب مقتضائے مقام ہو - چونکہ مقتضائے مقام کے لحاظ سے بلاغت کے اسلوب بیشمار ہو سکتے ہیں، لہذا ایک جامع و مانع اصول واضع نے قرار دے دیا - جب زمانے نے ترقی کا قدم آگے بڑھایا تو علماء نے دیکھا کہ یہ تعریف بلاغت کافی نہیں ہے - بلکہ ناقص ہے - یہ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص کا کلام حسب مقتضائے مقام ہو لیکن بہت بھدے اور بھونڈے طریقے سے کہا ہو تو کیا وہ عبارت بلیغ

کہی جائے گی؟ ہرگز نہیں۔ لہٰذا ضرور ہے کہ عبارت فصیح بھی ہو۔ اب دوسرا جزوِ بلاغت کا یہ قرار پایا کہ کلام فصیح بھی ہونا چاہیے۔ جب ہاروں رشید خلیفہ عباسی کا عہد آیا تب اُس نے کہا کہ ہنوز بلاغت کی تعریف ناقص ہے۔ ممکن ہے کہ ایک شخص کلام حسب مقتضائے مقام کرے، اور فصاحت بھی ہو، لیکن اگر وہ تکرار لفظی کرتا ہے یا مضمون کی تکرار اُس کے کلام میں ہے یا وہ تھوڑے سے مضمون کو بہت طول عبارت میں کہتا ہے تو کیا اُس کا کلام، بلاغت التزام کہا جاسکتا ہے؟ نہیں ہرگز نہیں، اُس کا قول تھا "اَحسَنُ الکلامِ مَا قَلَّ وَ دَلَّ" یعنی سب سے اچھا کلام وہ ہے جس میں تھوڑی عبارت میں وسیع معنی پیدا ہوں۔ چونکہ ہاروں رشید اقسام علوم میں یگانۂ روزگار تھا اور مجتہد کا درجہ رکھتا تھا، اس کا قول علماء نے پسند کیا اور تیسرا جزو بلاغت کی تعریف میں حسب تجویز ہاروں رشید اضافہ کیا گیا۔ اب بلاغت کی تعریف مکمل ہوگئی۔ یعنی (۱) کلام حسب مقتضائے مقام ہو۔ (۲) کلام میں فصاحت بھی ہو اور (۳) عبارت "ما قَلَّ و دَلَّ" ہو۔ یعنی الفاظ کم ہوں اور معنی وسیع ہوں۔

میں آپ کو پہلے بلیغ نثر کی ایک مثال دوں جو مورخوں کے نزدیک بہت مشہور ہے۔ مامون الرشید خلیفہ عباسی کا قائد اعظم طاہر ذوالیمینین تھا جو سیف و قلم دونوں کا مالک سمجھا جاتا تھا۔ اُس نے مامون کو ایک خط لکھا۔ مورخوں نے اُس کا ترجمہ اُردو میں کیا ہے۔ وہ یوں ہے "میں امیرالمومنین کو خط لکھ رہا ہوں۔ فوج اور سرداران فوج اطاعت و انقیاد کے اُس اعلیٰ درجے پر

ہیں جہاں تک ایسی فوج کا ہونا ممکن ہے جس کی تنخواہیں چڑھی ہوں اور وہ تباہ حال ہو رہی ہو" اس جملے کے چھ معنی ہو سکتے ہیں کہ (۱) ظاہر شکایت کرتا ہے کہ آپ کیوں تنخواہیں چڑھائے ہوئے ہیں جس سے فوج تباہ حال ہو رہی ہے ۔ تنخواہیں ادا فرمائیے ۔ (۲) فوج گو بظاہر مطیع ہے اور بغاوت نہیں کرتی ہے لیکن بہت بیدل ہے، اگر تنخواہوں کے ادا کرنے میں دیر ہو گی تو آمادۂ بغاوت ہو سکتی ہے ۔ (۳) یہ میری کارگزاری بحیثیت سپہ سالار کے ہے کہ فوج مطیع و منقاد ہے اور باوجود اُس کی بے دلی اور تباہ حالی کے، میں اُس کو بغاوت سے روکے ہوئے ہوں ۔ (۴) فوج کی تنخواہیں فوراً ادا ہونا چاہیے تاکہ اُس کی تباہی دور ہو، ورنہ وہ جلد بغاوت اختیار کرے گی ۔ میں ذمہ دار نہیں ہوں ۔ حضور کو اطلاع دے کر اپنے فرض سے ادا ہوتا ہوں ۔ بہت اندیشہ ہے کہ ملک میں شورش پیدا ہو جائے ۔ (۵) فوج گو مطیع ہے لیکن بے دلی کے ساتھ اطاعت بظاہر کر رہی ہے ۔ اس اطاعت و انقیاد پر اعتبار نہ کرنا چاہیے ۔ ایسی فوج ہرگز جاں نثاری نہیں کر سکتی اور وقت کی منتظر رہے گی اور دھوکا دے گی ۔ (۶) اگر تنخواہیں ادا ہو جائیں گی تو فوج کی بے دلی اور تباہی دور ہو جائے گی اور مثل سابق فوج اطاعت شعار فرماں بردار اور جاں نثار ہو جائے گی ۔

اب نظم کی مثالیں سنیے ۔ بلاغت کے تمام اسلوب کا احصا کرنا بوجہ ضیق وقت کے ناممکن ہے ۔ صرف چند اسلوب کافی ہوں گے ۔

— مقبلؔ نے فارسی میں مرثیہ کہا ہے ۔ چنانچہ ایک شعر اُس کا ملاحظہ ہو ؎

بلند مرتبہ شاہے زصدر زیں افتاد اگر غلط نہ کنم عرش بر زمیں افتاد

امام حسینؑ کو شاہ بھی کہتے ہیں۔ جیسے جناب رسالتمآب صلعم کو شہنشاہ عرب۔ فقط شاہ کہنا شاعر نے کافی نہ سمجھا۔ بلند مرتبہ کے الفاظ بڑھائے۔ پھر کہا 'زصدر زیں افتاد'، زین کو صدر قرار دیا۔ اگر شاہ کی جگہ فقط 'حسینؑ' کہتا اور یہ کہتا کہ "ززین اسپ افتاد'، تو مطلب نکل آتا۔ مگر وہی بات ہوتی کہ ؎

دندان تو جملہ در دہان اند چشمان تو زیر ابروان اند

جو الفاظ شاعر نے مصرع اول میں کہے اُن سے جناب امام عالی مقام کی شان رفیع دکھائی پھر دوسرے مصرع میں کہتا ہے کہ گویا عرش زمین پر گر پڑا۔ ظاہر ہے کہ جب عرش گرے گا تو زمین کے اندام میں لرزہ آجائے گا بلکہ زمین پاش پاش ہوجائے گی۔ شاعر کا مقصود ان الفاظ سے یہ ہے کہ سننے والوں کے دِل ہل جائیں کہ بڑا سخت واقعہ ہوا۔

اب حضرت انیسؔ مرحوم فردوسی ہند کے کلام سے بلاغت کے اسلوب ملاحظہ فرمائیے۔ پہلے موقع عرض کر دوں تاکہ پورا لطف حاصل ہو۔ موقع یہ ہے کہ حضرت زینبؑ کے دونوں فرزند عونؑ و محمدؑ شربت شہادت نوش فرما چکے ہیں۔ حضرت عباسؑ علم بردار حضرت زینب علیہا السّلام سے میدانِ جنگ میں جانے کی اجازت ملنگتے ہیں، مگر وہ انکار کرتی ہیں۔ اس بنا پر کہ اگر تم مارے گئے تو میرے ماںجائے کا یار و یاور کون باقی رہے گا جو تمھاری مثل جاں نثار اور اُن کا قوت بازو ہو، لیکن حضرت عباسؑ اصرار کرتے ہیں کہ میں جاؤں گا۔ حضرت انیسؔ حضرت عباس علیہ السلام کی زبان سے کہتے ہیں کہ اے بہن ؎

رخصت طلب ہے شاہ سے اکبرؑ سالالہ فام
شہزادہ مرنے جائے سلامت رہے غلام
للہ رو کیے نہ اب اے خواہرِ امام
وہ امر کیجیے کہ بڑھے جس سے میرا نام
بیکس ہوں ، ساتھ ماں نہیں، سر پہ پدر نہیں
میں آپ کا غلام تو ہوں گو پسر نہیں

صاحبو ! یہ بند بظاہر اس قدر صاف ہے اور سلیس اور عام فہم اور الفاظ اس قدر سادہ اور دلنشیں ہیں کہ بلاغت کے نکتوں کی طرف ذہن یکایک انتقال نہیں کرتا - مگر نکات کو ملاحظہ فرمائیے - بند کے تیسرے مصرع میں "خواہرِ امام" کے الفاظ نہایت بلیغ ہیں - حضرت عباسؑ حضرت زینب کو امام حسینؑ کی بہن کہتے ہیں - حالانکہ وہ حضرت عباسؑ کی بھی بہن تھیں - ان الفاظ سے اُن کی شان رفیع دکھانا مقصود ہے اور در پردہ تعریض ہے کہ آپ مجھ سے وہ محبت نہیں رکھتیں جو حقیقی بھائی بہن میں ہوتی ہے - چونکہ درحقیقت حضرت زینبؑ اُن کی حقیقی بہن نہیں ، یہ تعریض زیادہ چبھتی ہوئی ہے - تعریض وہی زیادہ مؤثر ہوتی ہے ، جس میں واقعیت کا پہلو ہوتا ہے - پھر ٹیپ کا آخری مصرع نہایت کارگر ہے - "میں آپ کا غلام تو ہوں گو پسر نہیں" یعنی آپ مجھ کو اگر بیٹا سمجھتیں تو مجھے بھی اپنے صاحبزادوں کی طرح میدان کارزار میں جانے کی اجازت دیتیں تاکہ میں بھی جناب امام حسینؑ پر نثار ہو جاتا اور شہادت کی دولت حاصل کرتا - پس مجھے اپنا غلام ہی سمجھ کر اجازت دے دیجیے - کیا خوب اپنا انکسار دکھایا ہے اور حضرت زینبؑ کی شان بلند -

تشبیہ مرکب کا حسن ملاحظہ فرمائیے - جب حضرت عباسؑ پر چاروں طرف سے

برچھیاں چلنے لگیں تو اس منظر کو کس قدر خوشنما اور رفیع کر کے دکھایا ہے۔ کہتے ہیں ؎

یوں برچھیاں تھیں چار طرف اُس جناب کے　　جیسے کرن نکلتی ہے گردِ آفتاب کے

یا جب اہل بیت ایک رسّی میں باندھے گئے تھے تو اس اہانت آمیز صورت کو کس قدر خوشنما کر کے دکھایا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

گردنیں بارہ اسیروں کی بندھیں اور ایک رسن　　جس طرح رشتۂ گلدستہ میں گلہائے چمن

ایک اسلوب بلاغت یہ بھی ہے کہ دشمن کا بیان اپنے ممدوح کے مقابلے میں کیونکر کیا جائے۔ یہ نازک موقع ہوتا ہے۔ اگر اُس کو ذلیل، کمزور اور حقیر کہا جائے تو اُس پر فتح حاصل کرنا شان کو بلند نہیں کرتا اور اگر اُس کی شان و شوکت بیان کی جائے تو مرثیے میں حضرت امام کا تقدس مذہبی اُس کی اجازت نہیں دیتا۔ حضرت انیس دشمن کی مدح و ذم کو پہلو بہ پہلو رکھ کر بلاغت کا معیار قائم رکھتے ہیں۔ فرماتے ہیں ؎

بالا قد و کُلفت و تنومند و خیرہ سر　　روئیں تن و سیاہ دروں آہنی کمر

ناوک پیامِ مرگ کے، ترکش اجل کا گھر　　تیغیں ہزار ٹوٹ گئیں جس پہ وہ سپر

دل میں بدی، طبیعتِ بد میں بگاڑ تھا

گھوڑے پہ تھا شقی کہ ہوا پر پہاڑ تھا

چہرہ مہیب، غیظ سے آنکھیں لہو کے جام　　تھرائے سام خوف سے، کاندھے پہ وہ حُسام

موذی سیاہ بخت سیہ دل سیاہ فام　　کھاتا تھا لاکھ بل جو کوئی لے علیؑ کا نام

کُندہ سقر کے قعر کا، پُتلا گناہ کا

دشمن تھا خاندانِ رسالت پناہ کا

ایک ترک بادشاہ نے اپنے دشمن پر فتح پائی اور وہ قید ہو کر پا بجولاں دربار میں لایا گیا۔ پایہ تخت کے شاعر نے مبارکباد کا قصیدہ پیش کیا۔ اُس میں ایک شعر کی بلاغت پر غور فرمائیے ؎

ہمائے کہ بر عرش کردے خرام گرفتی و آزاد کردی ز دام

بادشاہ نے اس شعر کا صلہ بیس ہزار روپیہ دیا۔ قیدی نے اپنے سکریٹری کو حکم دیا کہ شاعر کو میری طرف سے دس ہزار روپیہ انعام دو۔ شاعر نے پوچھا کہ تم مجھے کس بات کا انعام دیتے ہو۔ میں نے تمھاری شکست لکھی ہے۔ قیدی نے جواب دیا کہ تم نے مجھے ہُما کہا۔ اگر تم مجھے شغال کہتے تو میں تمھارا کیا کر سکتا تھا۔ غور فرمائیے کہ شاعر نے دشمن کی تعریف میں کس قدر مبالغہ کیا۔ پہلے تو اُس کو ہُما کہا جو ایسا جانور ہے کہ جس پر سایہ ڈال دے وہ بادشاہ ہو جائے۔ پھر اُس کی شان رفیع دکھائی کہ وہ عرش پر پرواز کرتا ہے۔ لیکن اپنے بادشاہ کی شان کس قدر بلند کی کہ اُس نے ایسے بلند پرواز ہما کو گرفتار کر لیا اور پھر اُس کی طرف سے ایسا بے پروا اور مستغنی ہے کہ اُس کو چھوڑ بھی دیا۔ کیا اچھا اسلوب بلاغت ہے۔

صاحبو! یہاں فتح گڑھ میں ایک جلسے میں ایک اسپیکر نے اپنی تقریر میں بلاغت کا ایک اسلوب نئی طرح کا برتا۔ وہ آپ کے سننے کے لائق ہے۔ ۱۸۸۶ء میں نواب محمد اسحاق خاں جنٹ مجسٹریٹ ہو کر آئے تھے (یہ وہی اسحاق خاں تھے جو ۱۹۰۷ء میں یہاں ججی کے عہدے پر تھے) تھوڑے ہی عرصے میں وہ تبدیل ہوئے تو ان کا رخصتی جلسہ کیا گیا۔ ایک شخص نے

وداعی تقریر میں معمولی مدح و ثنا کے بعد اُن کے شوق شکار کی تعریف بھی کی۔ لوگوں میں سرگوشی ہونے لگی کہ یہ عامیانہ تعریف کیسی۔ شوق شکار کیا قابل تعریف چیز ہے، لیکن اُس شخص نے اس عامیانہ بات کو شاعرانہ پہلو سے بیان کیا۔ یعنی اُس نے یہ کہا کہ ہمارے نواب صاحب ممدوح کو شکار کا شوق ہے اور یہ اُن کی شان کے شایاں ہے۔ نہ اس لیے کہ جانوران صحرائی ہلاک ہوں اور آپ کی تفریح طبع ہو بلکہ اس وجہ سے کہ اس شکار کے ذریعے آپ کو دلوں کا شکار کرنے کی مشق بہم پہونچ جائے ؎

شہاں را ضرور ست مشق شکار   کہ آید پئے صید دلہا بکار

اس تقریر کے بعد سامعین نے بہت داد دی اور کہا کہ ہم نے پہلے بیان کو عامیانہ سمجھا لیکن تم نے آخر میں شاعرانہ پہلو اختیار کر کے کلام کو بلیغ کر دیا۔ اب میں بلاغت کے موضوع کو ختم کرتا ہوں اور فن شعر خوانی کے کچھ اصول عرض کروں گا۔

فن شعر خوانی

آپ صاحبوں کو میری زبان سے یہ سُن کر تعجب ہوگا کہ لوگوں کو فارسی شعر پڑھنا نہیں آتا۔ بعض لوگ فارسی میں خوب استعداد رکھتے ہیں مگر شعر غلط پڑھتے ہیں۔ یعنی جو فن شعر خوانی کے قواعد ہیں اُن سے واقف نہیں۔ پھر اُن پر عمل کرنا یعنی چہ؟ کوئی رسالہ اس وقت تک اس فن پر یا اس موضوع پر نہیں لکھا گیا ہے۔ بہر حال میری نظر سے نہیں گزرا اور باوجود تلاش کے مجھے نہیں ملا۔ میں ایک رسالہ لکھ رہا ہوں جس کا نام فن شعر خوانی ہوگا۔ اس میں مجھے اپنے اجتہاد اور ایجاد و اختراع سے تمامتر کام لینا پڑا۔ اُردو کے اشعار میں جب فارسی ترکیبیں آجاتی ہیں تو لوگ اکثر اُن کو بھی غلط

پڑھتے ہیں، جیسا کہ میں مثالوں کے ذریعے سے ظاہر کروں گا۔

(۱) یہ غلطی ہوتی ہے کہ ہائے ملفوظ کی جگہ ہائے مختفی اور مختفی کی جگہ ملفوظ پڑھتے ہیں۔

گدائے کہ برخاطرش بند نیست بہ از بادشاہے کہ خرسند نیست

--- بہ کی 'ہا' ملفوظ یا مظہرہ ہے اس کو یوں پڑھنا چاہیے کہ 'بہ' کی (ہ) 'از' کی (ز) میں مل کر آواز دے اور 'از' کا ہمزہ گر جائے یعنی آواز نہ دے۔ اگر اس کی آواز نکالی جائے گی تو 'بہ' کی (ہ) تقطیع میں نہ آئے گی۔ 'بہز' کی آواز نکلنا چاہیے۔ اسی طرح اس مصرع میں "دایہ جہرو راہبر بلوغ سہ پسر" سہ کی (ہ) کو ملفوظ نہ پڑھنا چاہیے بلکہ یہ ہائے مختفی ہے اور سین کی حرکت کو اشباع ہے۔ گو یہ (ہ) تقطیع میں محسوب ہو لیکن کچھ مضائقہ نہیں۔ چونکہ ہائے ملفوظ و مختفی کا امتیاز مشکل ہے، ان کے کچھ قواعد عرض کردوں۔

واضح ہو کہ 'ہا' کی دو قسمیں ہیں۔ ایک مختفی اور دوسری ہائے ملفوظ یا مظہرہ۔ سرمہ، نشانہ، خامہ اور شانہ میں ہائے مختفی ہے اور مہ، شہ، رہ، گنہ اور سیہ میں ہائے ملفوظ ہے۔ ان دونوں 'ہا' کا قافیہ جائز نہیں۔ قدماء کے یہاں مثلاً سعدی، صائب، حزیں کے یہاں شاذ و نادر دونوں کا اجتماع ہوگیا ہے۔ مگر متاخرین کے یہاں جواز نہیں۔ ہائے مختفی اپنے ماقبل کی حرکت کا اظہار کرتی ہے۔ خود 'ہا' کا اظہار کسی طرح روا نہیں۔ اکثر لکھنؤ والے مژہ کو سیہ اور گنہ کی طرح بہائے ملفوظ بولا کرتے ہیں۔ مژہ کی تین صورتیں ہیں ایک یہ کہ لفظ تقطیع میں دو حرفی محسوب ہو 'ژے' کی حرکت دبی زبان سے پڑھتے ہیں جیسے

ع ستم ست بر نگاہم مژہ را نقاب کردن

—— دوسرے یہ کہ سہ حرفی محسوب ہو مگر مضاف یا موصوف واقع نہ ہو تو جس طرح 'دل' بحالت اضافت جب سہ حرفی محسوب ہوتا ہے اُس وقت لام کے کسرے کو اشباع کرتے ہیں جیسے۔

دلِ عاشق برنگِ برق تڑپا

—— اسی طرح مژہ کی ژے کی حرکت کھینچ کر پڑھیں گے جیسے

ع۔ ہو گئی نوکِ مژہ نشتر مجھے

—— تیسرے یہ کہ مضاف یا موصوف واقع ہو، وہاں اس 'ہا' کو ہمزہ سے بدل دیں گے جیسے

ع۔ مژۂ یار نوکِ پیکاں ہے

—— یہاں یاد رکھنا چاہیے کہ دو حرفی لفظ والی "ہا" کبھی ہمزہ سے نہیں بدلتی۔ یہ بھی جاننے کے لائق ہے کہ ہائے ملفوظ بحالت جمع قائم رہتی ہے۔ جیسے راہ ہا، چاہ ہا، زرہ ہا، گرہ ہا، اور ہائے مختفی بحالت جمع ساقط ہو جاتی ہے جیسے میوہا، جاہا، خاہا، وغیرہ۔ اور بحالت تصغیر ہائے مختفی کاف عجمی سے بدل جاتی ہے جیسے جامگک، خامگک وغیرہ۔ اور بحالت اضافت، ہمزہ سے بدل جاتی ہے جیسے جامۂ من، خامۂ من، جامۂ نو وغیرہ۔ چونکہ دونوں 'ہا' کے غلط لہجے سے ادا کرنے میں شعر غلط ہو جاتا ہے اس لیے میں نے یہ حالات بالتفصیل آپ حضرات کی دلچسپی کے لیے بیان کیے۔

(۲) دوسری غلطی یہ ہوتی ہے کہ کسی جگہ ذرا ٹھہرنا چاہیے مگر وہاں

پڑھنے والا نہ ٹھہرے اور الفاظ کو ملاتا ہوا پڑھے۔ جیسے اس شعر میں سے

دمہ، دم فرو گیر چوں چشم گرگ　　　شدہ کار گرگینہ دوزاں بزرگ

اگر دمہ کے لفظ پر ذرا دَم نہ لیا جائے تو سامع سمجھے گا کہ پڑھنے والا دما دم کہہ رہا ہے اور دمبدم، معمولی معنی قیاس کرے گا جو غلط در غلط ہو جائے گا۔ دمہ کے کئی معنی ہیں۔ ایک معنی سردی کے بھی ہیں اور یہاں یہی معنی مُراد ہیں۔ نظامی نے جاڑے کی تعریف میں یہ شعر کہا ہے، جشن نوشابہ کے ذکر میں۔ جب دمہ کا لفظ ملایا نہ جائے گا تو سامع اگرچہ کہ دمہ کے معنی نہ جانتا ہو لیکن ذرا بھی ذہن سلیم رکھتا ہو گا تو اتنا سمجھ لے گا کہ کوئی چیز ہے جو دم گھونٹے دیتی ہے، چشم گرگ کی طرح۔ پھر آگے کے اشعار جب کہ پڑھے جائیں گے تو اُن میں صاف صاف جاڑے کا ذکر ہے۔ سامع قیاس کرے گا کہ دمہ سردی کے معنی میں ہے۔ لیکن جب کہ دمہ کو دم کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے گا تو سامع سوائے دما دم کے کچھ معنی نہیں سمجھ سکتا۔ نہ آگے کے اشعار اس کو دما دم کے معنی سمجھنے میں مدد دیں گے۔

(۳) اسی طرح کسی موقع پر ایک مصرع کے الفاظ دوسرے مصرع میں ملا کر پڑھے جائیں گے جیسے ان اشعار میں سے

الا تا نگرید کہ عرش عظیم　　　بلرزد ہمی چوں بگرید یتیم
الا تا نخفتی بغفلت کہ نوم　　　حرام ست بر چشم سالار قوم

ان اشعار کے لفظوں کی تقسیم اس طرح پر کرنا چاہیے۔

الا تا نہ گرید، کہ عرش عظیم بلرزد　　　ہمی چوں بگرید یتیم

الا تا نخفتی بغفلت، کہ نوم حرام ست برچشم سالار قوم

—— شعر اول میں لفظ "نگرید" اور شعر دوم میں لفظ "غفلت" پر ذرا ٹھہرنا چاہیے۔

(۴) بعض الفاظ پر زور دینا چاہیے جس کو انگریزی میں emphasis کہتے ہیں۔ اُس کے قواعد کا احصاء کرنا مشکل ہے۔ صرف مذاق سلیم سے امتیاز ہو سکتا ہے کہ کون کون الفاظ زور دیے جانے کے قابل ہیں۔ چند نمونے دکھائے جاتے ہیں جو عام فہم ہیں۔ موشگافیوں سے قطع نظر کی جاتی ہے ؎

امام ثامن ضامن۔ حریمش چوں حرم آمن زمین از حزم او ساکن۔ سپہر از عزم او پویا

—— پہلے مصرع میں حریم اور حرم پر اور دوسرے مصرع میں حزم اور عزم پر زور دینا چاہیے۔ مذاق سلیم بتاتا ہے کہ حزم اور عزم قوافی ہیں اور حریم اور حرم میں بڑی جنسیت ہے لہذا انہی پر زور دینا چاہیے۔ شاعر کی قادر الکلامی یہ الفاظ ظاہر کر رہے ہیں ؎

تنش از قیر آلودہ دلش از شیر آمودہ بروں پُر سرمہ سودہ درون پُر لولوئے لالا

—— مصرع اول میں 'قیر' اور 'شیر' پر زور دینا چاہیے۔

نہال باغ علیین۔ بہار مرغزار دیں نسیم روضہ تسنیں۔ شمیم دوحہ طاہا

—— مصرع اول میں نہال اور بہار پر اور مصرع ثانی میں نسیم، روضہ اور شمیم، دوحہ، گویا چھ الفاظ پر زور دینا چاہیے ؎

خرد شد ہر دم از گردون کہ پوشد برتن ہامون زسنبل کسوت اکسون زلالہ خلعت دیبا

—— اس شعر کے مصرع اول میں 'خرد شد' اور 'پوشد' اور مصرع آخر میں

کسوت، وخلعت پر زور دینا چاہیے کیونکہ یہ تمام الفاظ جن پر زور دیا گیا ہے شاعر کا کمال شاعری ظاہر کر رہے ہیں۔ یہاں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ سجع کے تین قوافی عموماً زور دینے کے لائق اس وجہ سے نہیں ہوتے کہ شاعر اُن کے لانے کا پابند ہے اور وہ اُن کو تلاش کر کے لانے پر مجبور رہے۔ اُن میں آورد بھی ہو سکتی ہے لیکن اُن کے علاوہ جو اور قوافی شعر میں آ گئے ہیں وہ اُس کی روانی اور سلاست طبعی پر دلیل قاطع ہیں اور اُس کی قادر الکلامی ظاہر کر رہے ہیں اور محض آمد ہی آمد دکھا رہے ہیں لہذا زور دینے کے لائق ہیں۔ غرض کہ وجدان صحیح اس معاملے میں اچھی رہنمائی اور رہبری کرے گا۔

(۵) شعر پڑھنے کے لیے ضرور ہے کہ الفاظ کے اعراب غلط نہ کیے جائیں۔ میں صرف دو لفظوں کا ذکر اس وقت کروں گا جو عموماً غلط بولے جاتے اور غلط پڑھے جاتے ہیں۔ "مطلع اور موقع" اُردو میں بلا ترکیب فارسی جب یہ لفظ بولے جائیں گے تو عموماً 'لام' اور 'قاف' پر فتحہ کہا جاتا ہے اور یہ ٹھیک ہے، اِلاّ اُس حال میں کہ جملے میں یہ الفاظ مفعول یا مجرور[۱] پڑیں۔ اس صورت میں 'لام' اور 'قاف' پر کسرہ بولا جائے گا۔ لیکن فارسی میں چاہے بلا ترکیب یا مع ترکیب ان کا استعمال کسی طرح ہو 'لام' یا 'قاف' مکسور[۲] ہی بولا جائے گا۔ اُردو میں بھی جب یہ لفظ ترکیب فارسی کے ساتھ استعمال کیے جاتے ہیں تو غلطی سے لہجے میں 'لام' اور 'قاف' کو مفتوح کہا جاتا ہے۔ اس کی احتیاط کرنا چاہیے۔ اسی طرح سیکڑوں الفاظ ہیں

---

[۱] جیسے موقع کو، مطلع سے۔ [۲] از غیاث اللغات و منتخب۔

جن کے اعراب اگر صحیح معلوم نہیں ہیں تو ان کا لہجہ غلط ہو جائے گا اور شعر غلط پڑھا جائے گا۔ اس موضوع کو ختم کر کے اب میں حرکات اور اشارات کا ذکر کروں گا جن سے شعر خوانی میں کام لیا جاتا ہے۔

حرکات وسکنات واشارات

یورپ میں ایسے ماہرین فن ہیں جنھوں نے تمام عمر کسی ایک فن کے حاصل کرنے میں صرف کر دی۔ پروفیسر ہارٹلی فن شعر خوانی کے ماہر آکسفرڈ یونیورسٹی میں تھے۔ جنھوں نے ستّر برس کی عمر تک صرف یہ ایک کام کیا کہ شعر پڑھا اور پڑھایا۔ شعر پڑھتے وقت وہ شعر کی صورت بن جاتے تھے اور شعر میں جو جذبات ہوتے تھے اُن کا مجسمہ گویا نظر کے سامنے آجاتا تھا۔ چہرے کی جُھرّیاں مِٹ جاتی تھیں اور خون کا دَورہ چہرے کی رگ وپے میں اس قدر ہوتا تھا کہ چہرے پر جوانی کے آثار نمودار ہو جاتے تھے۔ چشم و ابرو کے اشارات اور تیور سے شعر کے جذبات بتاتے تھے۔ ہاتھ کو یا جسم کے کسی اور حصّے کو جنبش نہیں دیتے تھے۔ شعر میں اگر رنج، خوشی، تعجب، حیرت، آرزو، غصّہ، رحم، سوگ وغیرہ کا ذکر ہے تو اُس کی تصویر نظر کے سامنے آجاتی تھی۔ اس فن کے ماہر ہندوستان میں حضرت انیسؔ مرحوم تھے بلکہ ماہر ہونے کے ساتھ اس کے موجد بھی تھے۔ میرے لڑکپن میں ایک بوڑھے آدمی نے جس نے انیسؔ و دبیرؔ کی مجالس ۶۰۱ دیکھی تھیں، حضرت انیسؔ کا حال شعر پڑھنے کا بیان کیا کہ پہلے وہ جس وقت منبر پر جاتے تھے تو مجلس میں خاموشی اور سنّاٹا ہو جاتا تھا۔ کوئی بات کسی سے نہ کرتا تھا۔ پہلے وہ آستین چڑھاتے تھے۔ یہ دیکھ کر

لوگوں کے دل ہلنے لگتے تھے۔ پھر جب وہ مرثیے کا بستہ ہاتھ میں لیتے تھے تو رقیق القلب سامعین کو رقت شروع ہونے لگتی تھی۔ اور جب وہ پڑھنا شروع کرتے تھے تو سیکڑوں سامعین چہروں کو رومال سے پونچھتے دکھائی دیتے تھے اور بین پڑھتے وقت تو گریہ وزاری اور آہ و بکا کا کچھ ٹھکانا نہ تھا۔

اس بیان میں کوئی بات مستبعد نہیں معلوم ہوتی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جب کوئی بیمار ہوتا ہے یا کسی کے پھوڑا نکلتا ہے اور ڈاکٹر عمل جرّاحی کرنے کے واسطے آتا ہے، تو اُس وقت عزیز و اقربا دوست و احباب جو مریض کے پاس ہوتے ہیں ڈاکٹر کو دیکھتے ہی اُن میں بعض کے دل دھڑکنے لگتے ہیں، کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ چیر پھاڑ کا وقت قریب ہے۔ پھر جب ڈاکٹر نشتر کا بکس جیب سے نکالتا ہے تو رقیق القلب لوگ منہ پھیر لیتے ہیں اور وہاں سے ہٹ جاتے ہیں کہ چیر پھاڑ کون دیکھے، حالانکہ ابھی ڈاکٹر نے کوئی کام جرّاحی کا نہیں کیا ہے۔ پھر ڈاکٹر اپنی جگہ سے اُٹھ کر مریض کے پاس جاتا ہے۔ اُس وقت اشخاص موجودہ میں سے چند شخص اور منہ پھیر لیتے ہیں اور وہاں سے سرک جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ عمل جرّاحی کے وقت شاید ہی دو ایک شخص ایسے کڑے جی کے ہوتے ہوں جو چیر پھاڑ دیکھنے کی ہمت کرتے ہوں۔ یہی حال ذاکر کا سامعین کے ساتھ ہے کہ اُس کو منبر پر پڑھنے کے لیے تیار اور آمادہ دیکھ کر سامعین کے دلوں پر رنج و غم اور حسرت و افسوس کی ایک کیفیت طاری ہو گی اور ہر شخص جوش مذہب سے لبریز ہو کر شہدائے کربلا کی شہادت کے حالات سننے اور اہل بیتؑ کی مصیبتوں کا

جانکاہ منظر دیکھنے کو آمادہ ہو جاتا ہو گا، اور آمادہ ہو جانا، ہے بھی ایک فطری امر، کیونکہ کربلا کے خونیں میدان میں خاندان رسولؐ کے بوڑھوں، نوجوانوں اور بچوں کو جس بیدردی سے تڑپا تڑپا کر بھوکا پیاسا شہید کیا گیا، اُس کا حال سُن کر اپنے تو اپنے اغیار بھی رُو دیتے ہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ اِس وقت چند ہی کلمات سُن کر بعض حضرات کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ مناسب ہے کہ تھوڑا یہ حال بھی سُنا دیا جائے کیونکہ انیسؔ کی داد دینا ان واقعات کے جاننے پر منحصر ہے۔ لکھا ہے کہ جب امام حسینؑ کربلا پہنچے تو آپ کے ہمراہ صرف بہتّر آدمی تھے۔ جن میں کچھ بوڑھے کچھ جوان اور کچھ کم سِن بچے تھے۔ کچھ مخدرات عصمت تھیں۔ حضرت امام عالی مقام مسلمانوں کے آخری نبی حضرت محمد صلعم کے چہیتے نواسے، بی بی فاطمہؑ کے لاڈلے بیٹے اور حضرت علیؑ کے پیارے فرزند تھے۔ کربلا کا جب واقعہ رونما ہوا تو سالہ ۶۱ھ تھا۔ اس وقت مذہب کی آڑ میں مسلمان وہ سب کچھ کر رہے تھے جو ان کے رسولؐ نے منع کیا تھا۔ وہی لوگ اولادِ رسولؐ کے دشمن تھے۔ اُنہی لوگوں نے امام عالی مقام کو بُلا کر مع عزیز و اقارب و احباب تین دن کا بھوکا پیاسا شہید کیا۔ سب سے اہم واقعہ چھ مہینے کے شیرخوار بچے کا ہے کہ امام عالی مقام اس کو ہاتھوں پر لے کر میدان میں آئے اور اشقیا سے بچّے کے لیے پانی کا سوال کیا۔ ایک ظالم نے ایسا تاک کر تیر مارا کہ وہ بے زبان بچہ باپ کے ہاتھوں پر تڑپ کر شہید ہو گیا۔ میرے خیال میں تو ایسا ظلم ازل سے اب تک نہیں ہوا اور قیامت تک نہ ہو گا۔ یہی وہ دردناک واقعات ہیں جن کو سُن کر ہر ایک روتا ہے اور امامؑ کے اہلبیتؑ پر شہادت کے بعد جو

مظالم ہوئے اور سخت تکالیف و مصائب کا سامنا ہوا وہ حالات سُن کر پتھر دل بھی پانی ہو جائیں اور رقیق القلب لوگوں پر رقّت کا طاری ہونا تو معمولی بات ہے! اور پھر ذاکر بھی کون حضرت انیس مرحوم جن کے پڑھنے کی دھاک بندھی ہوئی تھی اور جن کا ایک ایک شعر نشتر کا کام کرتا تھا، جن کے ایک ایک لفظ میں خون جگر کی چاشنی ہوتی تھی۔

حضرت انیس صرف چشم و ابرو کے اشارے سے جذبات کو ادا کرتے تھے۔ کبھی خاص موقعوں پر ہاتھ کو بھی جنبش دیتے تھے لیکن اُن کے اشارات و حرکات نہایت متانت کا پہلو لیے ہوتے تھے۔ ایک ذاکر نے اُن کی نقل کرنا چاہی اور چاہا کہ مرثیہ پڑھتے وقت ایسا بتائے کہ ہر بات اور ہر جذبے کو حرکات سے ادا کرے۔ ایک پہلوان کا ذکر آیا۔ مصرع یہ تھا کہ "آیا تھا بھبکتا یہ دبکتا ہوا بھاگا" اس کو انھوں نے یوں بتایا کہ پہلے تو بھبکے اور پھر دب کر اور سمٹ کر پیچھے ہٹے۔ اُن کا بھبکنا اور دبکنا لوگوں کو ایسا بھونڈا اور بیہودہ معلوم ہوا کہ سب ہنس دیے اور بہت دیر تک ہنسی بند نہ ہوئی۔ جب اُنھوں نے بَین پڑھے تو کسی کو رقت نہ ہوئی۔ سامعین منہ پر رومال رکھے ہوئے ہنس رہے تھے اور ضبط نہ کر سکتے تھے، کیونکہ ذاکر کا بھبکنا اور پھر دب کر پیچھے ہٹنا سب کے پیش نظر تھا۔ غرض کہ ذاکر کو بہت شرمندگی ہوئی۔ وہ یہ نہ سمجھے کہ کجا وہ اور کجا انیس ع ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا۔

ع نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند۔

مقصود اس سے یہ ہے کہ شعر پڑھتے وقت زیادہ بتانا اور خلاف تہذیب

دو اب مجلس اشارات و حرکات کرنا اہل مجلس کے لیے موجب ریشخند ہوتا ہے۔
اس سے پرہیز چاہیے بلکہ چشم و ابرو کے اشارے بھی اعتدال کے اندر رہیں۔
ورنہ ان میں بھی مبالغہ کرنا رقاصہ اور مُغنیہ کے بھاؤ سے مشابہ ہو جائے گا۔
بزم مشاعرہ ہو کہ مجلس عزا سامعین کے نزدیک قابل استہزا سمجھا جائے گا۔
ممالک یورپ میں اس فن کے ایسے ماہر ہیں کہ اگر ایک ہی مصرع یا شعر میں
متضاد الفاظ پاس پاس جمع ہوں تو ان کو بھی اشارات و حرکات سے اس خوبی
کے ساتھ ادا کریں گے کہ تصنع معلوم نہ ہوگا۔ مثلاً رنج و خوشی، آرام و تکلیف،
محبت و نفرت کو اس طرح بتائیں گے کہ رنج کے لفظ پر جو لہجے میں غم ہوگا تو
فوراً خوشی کے لفظ پر آواز بدل جائے گی۔ اسی طرح محبت کے لفظ پر ایسی
آواز نکلے گی کہ جس سے محبت ٹپکے اور فوراً نفرت کا لفظ آتے ہی آواز اور
صورت ایسی بدل جائے گی کہ نفرت برسے۔ یہ تبدیلی آواز اور تغیر صورت
بلا قصد ہوگی۔ یہ بات نہایت مشکل ہے۔ عمر بھر محنت کرے تب حاصل ہو سکتی
ہے۔ چونکہ اشارات و حرکات سے جذبات کا ادا کرنا فن شعر خوانی سے متعلق
ہے اور اس میدان میں قدم رکھ کر لوگ بے راہ چلنے لگتے ہیں اس لیے
میں نے بطور مختصر اس کا ذکر کر دیا۔

صاحبان والا شان! میں نے جو موضوع قرار دیے۔ مجھے وہ وقت مقررہ
کے اندر عرض کیے۔ شرح و بسط کے ساتھ عرض کرنے کے واسطے تو کئی روز
درکار ہیں۔ اب میں زیادہ سمع خراشی نہ کروں گا۔ اکثر حضرات سادہ جی "چغد الشعرا"[۱]

---

[۱] ایک مشہور ظریف شاعر کا تخلص ہے ۱۲

کا کلام سننے کے مشتاق ہوں گے تاکہ تفریح طبع ہو ۔

اب میں صرف بزم مشاعرہ کی نسبت یہ عرض کروں گا کہ ایسی انجمنوں میں شاعروں اور سخن شناسوں کا جمع ہونا علم و ہنر کے حق میں نہایت مفید ہے اور جو حضرات فن شعر گوئی کا ذوق رکھتے ہیں اُن کے سمند شوق پر تازیانے کا کام کرتا ہے ۔ ایک دوسری خوبی بزم مشاعرہ میں یہ ہے کہ مختلف مذاہب و مراسم و عقائد کے اشخاص ایک جگہ جمع ہوتے ہیں اور باہم برادرانہ اتحاد سے پیش آتے ہیں جس سے یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ علم و ہنر کی ترقی کے سوا اتفاق باہمی بھی بڑھتا ہے ۔

سرسیّد میموریل فنڈ

اور

مُسلِم یونیورسٹی کے لیے چندے کی اپیل

ماہ ستمبر ۱۸۹۸ء میں بمقام ٹون ہال فرخ آباد ایک جلسہ، ہندوؤں اور مسلمانوں کا زیر صدارت جناب مسٹر آر، پی ڈیوہرسٹ صاحب بہادر کلکٹر و مجسٹریٹ ضلع اس غرض سے منعقد کیا گیا تھا کہ سرسید میموریل فنڈ کے لیے چندہ جمع کیا جائے۔ علی گڑھ سے ایک ڈپوٹیشن لبسرکردگی جناب آفتاب احمد خاں صاحب بیرسٹر آکر فتحگڑھ میں ٹھہرا تھا۔ مرزا عرفان علی بیگ ڈپٹی کلکٹر فرخ آباد، یہاں کی لوکل کمیٹی کے پریسیڈنٹ تھے اور میر کرار حسین مرحوم مختار عدالت اُس کے سکریٹری تھے۔ ان دونوں صاحبوں نے مُشران صاحب سے ڈپوٹیشن کی تائید میں اسپیچ دینے کی فرمائش کی۔ میموریل فنڈ کا مقصد یہ تھا کہ علی گڑھ کالج کو بیادگار سرسید مرحوم، یونیورسٹی کے درجے پر پہونچایا جائے۔ جو اسپیچ دی گئی، درج ذیل ہے:-

میر مجلس اور حضرات انجمن!

سجدے کی جا ہے شکر خدا کا مقام ہے   موقع ہے آج کیجیے کرنا جو کام ہے
کالج کے حامیوں کا یہاں ازدحام ہے   اب حُسنِ اتفاق میں کس کو کلام ہے
وہ کام ہو کہ روم سے تا شام نام ہو ✤ وہ عزم ہو کہ بخت سکندر غلام ہو

آج کا جلسہ ایک خاص نوعیت رکھتا ہے - میں نے اس شہر میں بڑے بڑے جلسے دیکھے ہیں - کسی میں ہندو مسلمان دونوں اس کثرت سے جمع نہیں ہوے - اگر یہ کہا جائے کہ یہ ہندوؤں کا جلسہ ہے تو مسلمانوں کو اس کثرت سے شریک ہوتے، میں نے نہ دیکھا تھا - اگر کوئی یہ کہے کہ یہ خاص مسلمانوں کا جلسہ ہے تو یہ پہلا موقع ہے کہ ہندو ایسے جلسے میں اس کثیر تعداد سے جمع ہوے ہیں - صاحب کلکٹر بہادر کی رونق افروزی بھی اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ یہ جلسہ سرکاری طور پر کیا گیا ہے کہ جس کے باعث اتنا مجمع ہے - اصل یہ ہے کہ سرسید مرحوم کے نام کا جادو ہے جو ہم سب کو یہاں کھینچ لایا ہے اور اُسی شہید قوم کے کارناموں کا نقش ہمارے دلوں پر سویدا کی طرح ہے، جو جذب مقناطیسی سے اس وقت ہم سب کو اس جلسے کی طرف کھینچ رہا ہے -

میرے نزدیک ہندوؤں نے جوق در جوق آکر یہ ثابت کر دیا ہے کہ جب لیاقت یا حُسنِ عمل کی داد دینے کا موقع آتا ہے تو وہ فیاضانہ خیالات ظاہر کرتے ہیں اور دریا دلی سے کام لیتے ہیں اور خودغرضی یا مذہب یا قومیت کا خیال چھوڑ دیتے ہیں -

یہ کہا جاتا ہے کہ دوستی کالے گورے کا امتیاز نہیں جانتی، اسی طرح قدردانی اور شکرگزاری بھی مذہب اور قومیت کا فرق نہیں رکھتی - اگر قابلیت، قومی ہمدردی اور حسن عمل قابل قدر چیزیں ہیں تو ہر شخص کو بلا خیال مذہب و قومیت کے اس فنڈ میں شریک ہونا چاہیے - میں خود اپنی نسبت نہیں

کہہ سکتا ہوں کہ اس وقت کس فرقے اور کس جماعت کی طرف سے اپیل کر رہا ہوں - آیا ہندوؤں کی طرف سے یا مسلمانوں کی جانب سے - بہر حال میں اس وقت ایسے لوگوں کا قائم مقام ہوں جو انصاف پسند ہیں اور قومی ہمدردی اور لیاقت کی داد دینے والے ہیں اور ملک کی خیر خواہی اور گورنمنٹ کی وفاداری کی قدر کرنے والے ہیں - لیاقت کی قدر شناسی کا سبق ہم کو انگریزوں سے سیکھنا چاہیے - ابھی حال میں میں نے کسی اخبار میں پڑھا ہے کہ مسٹر منموہن گھوش کی یادگار منانے کے لیے انگلستان میں چندہ کیا گیا ہے - زرا غور فرمائیے گا، کجا بنگالہ کجا انگلستان، سمندر پار ہزاروں میل کا فرق ع

بہ بیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا - مذہب و ملت اور قومیت کا فرق، اس سے بھی زیادہ گویا سیاہ اور سفید کا فرق - اس پر مستزاد، جیسا کہ کہا جاتا ہے، کہ بنگالیوں سے انگریز بہت جلتے ہیں - اس بنگالی کی یادگار منانے میں، ظاہر ہے کہ انگریزوں نے ثابت کر دکھایا ہے کہ قابلیت کی قدردانی کرنے میں اور دوست کے ساتھ دوستی کا سچا برتاؤ اور اخلاص برتنے میں ہم، ذات، مذہب، قوم، جماعت کا کچھ خیال نہیں کرتے، نہ کالے گورے نہ فاتح مفتوح میں کچھ تمیز کرتے ہیں -

سر گور اُوسلی صاحب کا حال آپ نے پڑھا ہوگا، جب ۱۸۱۱ء کے شروع میں بعنوان سفارت انگلستان کی طرف سے صاحب موصوف فتح علی شاہ قاچار کے دربار میں گئے، اُس وقت کچھ عرصے تک شیراز میں اُن کا قیام ہوا - وہ خود لکھتے ہیں کہ "میں وہاں اکثر شیخ سعدی کے مزار کی زیارت کیا

کرتا تھا۔ مسٹر فریکلن سیاح نے جو سعدی کی قبر کا حال اپنے سفرنامے میں لکھا ہے میں نے وہ بچشم خود دیکھا۔ وہ تحریر فرماتے ہیں:۔

"حقیقت میں قبر بہت بوسیدہ ہوگئی ہے اور عنقریب کوئی نشان ایسا باقی نہ رہے گا جس سے معلوم ہو کہ وہ خطۂ ایران کا فخر، جو زہد و تقویٰ، ذہن و جودت اور علم و فضل میں اپنا مثل نہ رکھتا تھا کہاں اور کس جگہ دفن ہوا ہے۔ مجھے جو حسن عقیدت، شیخ اور اُس کے کلام کے ساتھ تھا، اُس نے مجھے اس بات پر آمادہ کیا کہ اپنے پاس سے روپیہ خرچ کر کے شیخ کے مقبرے کی مرمت کرادوں، مگر حسین علی مرزا نے، جو شاہ ایران کا پانچواں بیٹا اور فارس کا گورنر تھا، مجھ سے بہت اصرار اور سرگرمی سے یہ کہا کہ آپ کیوں تکلیف اُٹھاتے ہیں، میں خود سعدی کی قبر کی مرمت اُسی خوش اسلوبی سے کرادوں گا جس طرح کریم خاں زند نے حافظ شیرازی کے مقبرے کی مرمت کرائی تھی، لیکن افسوس کہ اُس شہزادے نے اپنا وعدہ پورا نہ کیا۔"

صاحبو! کیا عبرت کی جگہ ہے کہ ایک عیسائی مذہب اپنے ملک سے ہزاروں کوس نکل کر ایک اجنبی ملک میں اپنے کار خاص پر جاتا ہے اور وہاں سفر کی حالت میں ایک مسلمان مصنّف کی یہ قدر کرتا ہے کہ اپنے پاس سے روپیہ خرچ کر کے اُس کے مقبرے کی مرمت کرانا چاہتا ہے، حالانکہ کوئی واسطہ مذہب یا قوم یا ملک کا اُس کے ساتھ نہیں رکھتا، اور ایک مسلمان شاہزادہ

باوجودیکہ اس مصنف کا ہم وطن ، ہم مذہب اور ہم قوم ہے ، یہ بے اعتنائی عمل میں لاتا ہے ! انہی سر گور کے ایک چھوٹے بھائی اور اہل کمال کے قدرشناسوں کا ایک نمونہ ، ہمارے میر مجلس مسٹر ڈیوہرسٹ صاحب بہادر ہیں ۔ باوجودیکہ مسلمانوں یا ہندوؤں سے سوائے انسانیت کے رشتے کے ، کوئی دوسرا واسطہ قوم یا مذہب یا ملک وغیرہ کا نہیں رکھتے ، لیکن سرسید کی قدردانی میں آپ ، اُن کے ہم قوم اور ہم وطن لوگوں سے پیچھے نہیں ہیں اور یقیناً اُسی خوشی سے چندے میں شریک ہوں گے جیسے ہم سب لوگ ۔

صاحبو ! جب کہ مہذب قوموں میں غیر قوموں کے ساتھ یہ قدردانی ہے ، جس کی مثالیں ابھی عرض کی گئیں ، تو سرسید ہمارے تو بھائی تھے ۔ ہم اُن کے عمدہ کاموں کی داد دیتے ہیں ، تو کیا بڑی بات ہے ۔ اُس فدائے قوم نے کتنا بڑا احسان اپنی قوم پر کیا ہے کہ اُس کو پستی زوال سے اُبھار کر اوج کمال پر پہونچا دیا ہے ۔ سرسید پہلا شخص تھا جس نے یہ کہا :"الاسلام ھوا الفطرۃ والفطرۃ ھی الاسلام"۔ وہ جس ملک اور جس قوم میں پیدا ہوتا ، اُس کے لیے باعث افتخار ہوتا ۔ علی گڑھ کالج قائم کرنے سے سرسید کا منشا یہ تھا کہ ایسا کالج ہونا چاہیے جہاں معلم نہ صرف اُستاد کا تعلق شاگردوں کے ساتھ رکھیں ، بلکہ اُن کے ولی اور والدین کے قائم مقام ہوں ۔ ایسی تعلیم گاہ ہو کہ جہاں تعلیم نظری وعملی دونوں میسر آئیں ، جہاں طلبہ آپس کی خیر خواہی اور ایک دوسرے پر اعتبار کرنا سیکھیں ، جہاں خویشتن داری سکھائی جائے ، جس کو انگریزی میں "سیلف ریسپکٹ" کہتے ہیں ۔ ایسا دارالعلم ہو جہاں طلبہ گورنمنٹ کی خیر خواہی

اور وفاداری کرنا سیکھیں اور اُن نعمتوں کی قدردانی کریں جو دولت برطانیہ کی بدولت ہم کو حاصل ہیں۔ وہ یہ بات چاہتے تھے کہ قوم کا ہر فرد، نہایت صلح جو، اور بکار آمد سٹیزن (متمدن) بن جائے۔ وہ دلدادۂ اسلام یہ چاہتا تھا کہ مسلمانوں میں اخوت اسلامی اور حمیت اسلامی پیدا ہو جائے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ کالج کے یہ اغراض قابل پسند نہیں۔ علی گڑھ کالج اس بات کی یادگار ہے کہ سر سید نے اپنی قوم کی خدمت یوں نمایاں طور پر کی اور اب جو متفقہ کوششوں سے اُس کالج کو یونیورسٹی کے درجے پر پہونچائیں گے، تو وہ اس بات کی یادگار ہوگا کہ قوم نے سر سید کے احسانات کا شکریہ یوں نمایاں طور پر ادا کیا ہے۔

صاحبو! کالج کی عمارتوں کو خوب وسیع اور عالیشان کیجیے، بورڈنگ ہاؤس کے طلبہ کی تعداد بڑھائیے۔ وظائف اور انعامات کثرت سے قائم کیجیے۔ غرضکہ کالج کو تعلیم کا مرکز بنا دیجیے تاکہ وہ مثل بغداد کے مدرسۂ نظامیہ یا قرطبہ کی یونیورسٹی یا غرناطہ کے دارالعلوم کے تمام اسلامی دنیا میں مشہور و معروف ہو جائے۔ عہد سلطنت عباسیہ میں مدرسۂ نظامیہ نے اور دولت بنی اُمیہ کی بدولت تعلیم گاہ قرطبہ و غرناطہ نے وہ فروغ پایا تھا کہ اسلامی دنیا کے سوا یورپ و افریقہ کے دُور دراز ملکوں سے طالب علم وہاں پہونچا کرتے تھے اور جو شخص اُن درسگاہوں سے پڑھ کر نکلتا تھا اُس کے مستند سمجھنے میں کسی کو کلام نہ ہوتا تھا۔ اسی طرح یہ علی گڑھ کالج جب محمڈن یونیورسٹی کے درجے پر پہونچ جائے گا، تو تمام اسلامی دنیا میں مشہور ہو سکتا ہے اور ہندوستان کے مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کے حق میں بڑی رحمت ثابت ہوگا۔ چھوٹے چھوٹے مدرسے اور مکتب جابجا قائم

کرنے سے احتراز کیجیے، ورنہ قوت تقسیم ہوجائے گی۔ ہر شخص کو چاہیے کہ درمے، قدمے، سخنے اسی کالج کو مدد دے، تاکہ یہ بڑا کام جو آپ نے ہاتھ میں لیا ہے، انجام پاجائے۔ ورنہ چھوٹا مدرسہ چلے گا نہ بڑا کالج، دونوں بے ثبات ہوکر نیست و نابود ہوجائیں گے۔ فرض کیجیے کہ آفتاب کے بہت سے ٹکڑے کرکے تمام آسمان مرئی پر پھیلا دیے جائیں تو کیا اُس کا یہ جاہ و جلال باقی رہے گا، اور پھر کیا وہ اپنی روشنی و تمازت سے حیوانات و نباتات کو وہی فائدہ پہونچا سکے گا جو اس وقت پہونچا رہا ہے؟ ہرگز نہیں۔ اگر سو مدرسے ایسے ہوں جو ناکافی تعلیم دیتے ہوں، اُن کے مقابل میں ایک کالج اچھا جو کامل تعلیم دے سکے۔

جب سرسید نے یہ کالج قائم کرنا چاہا تھا تو اُن کے مددگاروں کی رائے یہ تھی کہ کالج کی عمارتوں میں زیادہ روپیہ نہ لگایا جائے، بلکہ وہ تعلیم کی دوسری اغراض کے لیے محفوظ رکھا جائے، مگر واہ رے سرسید! صرف وہی شخص تھا جس نے اس رائے سے اختلاف کیا اور کالج کی عمارتیں کیمبرج یونیورسٹی کے نمونے پر شاندار اور وسیع بنوائیں اور کالج کو بہت بڑا مرکز تعلیم بنا کر ایک زبردست دارالعلوم بنا دیا جو تمام ملک میں مشہور ہوکر ہندوستان کے ہر حصے سے طالب علم کھینچ لایا۔ حسن اتفاق سے سرسید کا اپنے مشیروں کی رائے سے اختلاف کرنا، مسلمانوں کے حق میں ایسا ہی رحمت کا باعث ہوا، جیسا جنگ بلاسی کے وقت جنرل کلائیو نے اپنی کونسل کی رائے پر عمل کیا ہوتا اور پلاسی کی لڑائی نہ لڑی ہوتی تو بنگالہ فتح نہ ہوا ہوتا اور سلطنت انگلشیہ کی بنیاد نہ پڑی ہوتی۔ اسی طرح اگر سرسید نے عام رائے سے اتفاق کیا ہوتا تو اس وقت یقیناً

بجائے موجودہ عظیم الشان عمارتوں کے چند جھونپڑیاں مکتب خانوں کی ہوتیں، جن میں ملا لوگ بوریا بچھائے ہوئے لڑکوں کو قرآن پڑھایا کرتے اور اہل محلہ کی خیرات سے اُن کا گزارہ ہوا کرتا اور علی گڑھ سے باہر اُن مکتبوں کا نام بھی کوئی نہ جانتا۔

صاحبو! چھوٹی اور بڑی تعلیم گاہوں کا باہم مقابلہ کیجیے۔ ایک مڈل اسکول لیجیے اور ایک ہائی اسکول۔ دونوں میں مڈل کلاس ہے، دونوں جگہ یکساں کتابیں ہیں، مگر ہائی اسکول کے مڈل کلاس کے طالب علم بمقابلہ مڈل اسکول کے مڈل کلاس کے طلبہ کے، زیادہ لائق ہوں گے۔ پھر ہائی اسکول لیجیے اور کالیجیٹ اسکول۔ دونوں میں انٹرنس کلاس اور دونوں درجوں میں یکساں کتابیں پڑھائی جاتی ہیں، مگر کالیجیٹ اسکول کے انٹرنس کے طالب علم بمقابلہ ہائی اسکول کے انٹرنس کے طالب علم کے، زیادہ ہوشیار اور لائق ہوں گے۔ اسی طرح فرض کیجیے کہ ایک معمولی کالج ہے اور ایک یونیورسٹی کالج۔ دونوں جگہوں کے ایف، اے۔ بی، اے۔ ایم، اے کے طلبہ کا باہم مقابلہ کیجیے، تو یونیورسٹی کالج کے طلبہ کو آپ زیادہ لائق پائیں گے۔ نتیجہ یہ ہے کہ جتنی بڑی تعلیم گاہ ہوگی اور جتنے زیادہ لائق اور بیدار مغز اُستاد ہوں گے اُتنے ہی زیادہ لائق اور روشن دماغ اور بلند خیال شاگرد ہوں گے۔ پس آپ لوگ اگر اپنے کالج کو محمڈن یونیورسٹی کے درجے تک پہونچائیں گے تو یقیناً اور بھی زیادہ عمدہ تعلیم و تربیت آپ کے کالج میں میسر آئے گی اور مسلمانوں کو تعلیمی فائدے اس وقت کے مقابلے میں بہت زیادہ پہونچیں گے۔

صاحبانِ والا شان! یہ کہنا غلط اور سراسر غلط ہے کہ سرسید صرف مسلمانوں کے ہی خواہ تھے اور قوموں سے اُن کو کوئی تعلق نہ تھا۔ سرسید کی تقریریں جو وائیسرائے کی کونسل میں لوکل سیلف گورنمنٹ پر اور البرٹ بل کے پُر آشوب زمانے میں ہوئی ہیں، ظاہر کرتی ہیں کہ وہ شخص تمام ہندوستان کا وکیل ہو کر گفتگو کرتا تھا۔ ہمارے صوبے میں وہ پہلا شخص تھا جو ہندوستان میں پارلیمنٹ ہونے کی ضرورت انگریزوں پر ظاہر کرتا تھا۔ اگر ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہم چند مسائل پر اختلاف رائے تھا تو سرسید یہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں کو تعلیم یافتہ بنا کر وہ اختلاف دور کر دیں تاکہ مسلمان اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کو سمجھیں اور ملک کے خیر خواہ بنیں اور ہندوؤں کے ساتھ شیر و شکر ہو جائیں۔ اصل یہ ہے کہ ہر فرقہ آج کل ملکی اور قومی ترقی کو مدنظر رکھتا ہے، لہذا آزادی کے سبب کوئی فرقہ ایک طریق کو اور کوئی گروہ دوسرے اصول کو باعث عروج سمجھتا ہے۔ بہرحال نیک نیتی سے مختلف راہیں اختیار کرنے میں مآل وہی ہے کہ ایک منزلِ مقصود پر پہونچیں۔

صاحبو! مجھے احتمال ہے کہ مبادا میری گفتگو نے طول کھینچا ہو اور یہ بھی خیال ہے کہ ہنوز عملی کارروائی چندے کی ہونا باقی ہے، لہذا میں آپ کو اب زیادہ منتظر نہ رکھوں گا اور بالآخر میں آپ لوگوں کی خدمت میں اپیل کروں گا کہ ایسے کارِ خیر میں شریک ہو کر داخل حسنات ہوجیے اور اُس فدائے قوم کے مانند، جس نے قومی ہمدردی کا سبق آپ کو پڑھایا ہے، اس وقت فیاضی اور دریا دلی سے کام لے کر نام نیک بلکہ ثواب دارین حاصل کیجیے۔ میں آپ کی

خدمت میں اسلام کے نام سے اپیل کرتا ہوں جس کا حامی و مددگار سر سید تھا اور جس کی شان و شوکت زمانۂ سابق میں بے نظیر تھی۔ آپ مسلمانوں سے اُمید ہے کہ علوم و فنون کی اشاعت اور حکمت و فلسفہ کی سرپرستی میں وہی ذوقِ علمی ظاہر کریں گے جو زمانہ متوسط میں خلفائے عباسیہ و بنی اُمیہ کے عہد میں عروج اسلام کا باعث ہوا تھا۔ میں تمام ہندو صاحبوں اور آریا بھائیوں کی خدمت میں یہ اپیل کرتا ہوں کہ آپ اس کار نیک میں اُسی مستعدی اور فیاضی کے ساتھ شریک ہوں، جو آپ کے آباؤ اجداد اور برگزیدہ اسلاف کا مشہور طریقہ تھا۔ آپ لوگوں میں دیش اوپکار یعنی رفاہ ملکی اعلیٰ درجے کا عمدہ کام سمجھا جاتا ہے۔ اس سے زیادہ کیا اچھا کام ہو سکتا ہے کہ آپ چھ کروڑ مسلمانوں کو بے شمار تعلیمی فائدے پہونچائیں، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اپنے ملک کی فلاح و بہبود کریں گے۔ آخر میں ہر قوم و ملّت اور ہر طبقہ و جماعت کی طرف سے میں آپ کی خدمت میں اپیل کرتا ہوں کہ اس وقت، بلا خیال مذہب و قوم کے، نہایت سچے دل سے اُس حبیب وطن کی زندہ یادگار بنانے میں شریک ہوجیے۔

ہندو مسلم اتحاد

بماہ ستمبر ۱۹۲۷ء، ایک جلسۂ عام میں، جو ہندو مسلم اتحاد کی غرض سے منعقد ہوا تھا، مشران صاحب نے حسب ذیل خطبہ ارشاد فرمایا:۔

جناب صدر و حضرات انجمن!

آپ لوگوں کو معلوم ہوگا کہ ۸ ستمبر ۱۹۲۷ء کے جلسۂ عام میں، جو کہ ٹاؤن ہال میں اس غرض سے منعقد ہوا تھا کہ ہندو مسلم اختلاف کی زہریلی ہوا سے فرخ آباد کو محفوظ رکھا جائے اور یہاں مزید اتفاق و اتحاد پیدا کرنے کی کوشش کی جائے، چار اشخاص کو عملی اقدامات کرنے کے لیے منتخب کیا گیا تھا، جن میں خاکسار بھی شامل ہے۔ اس سلسلے میں میری پہلی تجویز یہ ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے تیوہاروں میں جو جلوس نکلتے ہیں، اُن میں بجائے ایک فرقے کے، دونوں فرقے برابر کا حصہ لیں اور اس طرح یکجہت و یکدل ہو کر جلوس اٹھائیں کہ دیکھنے والوں کو محسوس نہ ہو سکے کہ یہ ہندوؤں کا جلوس ہے یا مسلمانوں کا۔

فی الحال رام لیلا کا جلوس نکلنے والا ہے۔ اس موقع پر ہم کو ایسی یگانگت کا عملی مظاہرہ کرنا چاہیے کہ معمولی انتظامات جو پولیس کیا کرتی ہے، اُن کے علاوہ حکام کو کسی قسم کی مداخلت کی گنجایش باقی نہ رہے اور وہ بھی ہمارے مہذب و متمدن قوم ہونے کا اعتراف کر لیں۔

بھائیو! گو کہ میں ایک ہندو گھرانے میں پیدا ہوا ہوں اور مسلمان نہیں ہوں،

مگر میرے دل میں دونوں فرقوں کے لیے ایک سی جگہ ہے اور میں دونوں کو صرف "ہندوستانی" ہونے کی نظر سے دیکھتا ہوں اور اپنے آپ کو دونوں جماعتوں کا نمایندہ سمجھتا ہوں اور مجکو یہاں دونوں کی نمایندگی کا حق حاصل ہے۔ میں اوّل ہندؤوں کی نمایندگی کے طور پر یہ کہنے کا حق رکھتا ہوں کہ یہاں (ہمارے شہر میں) ہنود کی اکثریت ہے اور وہ کسی دوسرے گروہ کی معاونت کے محتاج نہیں، مگر باایں ہمہ وہ تنہا بغیر اپنے پڑوسی کی شرکت کے، کوئی کام کرنا نہیں چاہتے اور مسلم بھائیوں کو اپنا برابر کا شریک، بلکہ شریک غالب بنانا چاہتے ہیں۔ ہندؤوں کی محبت و مروت، جو مسلم بھائیوں کے ساتھ ہے، وہ ہندوستان کی تاریخ کا ایک سنہرا ورق ہے۔ اگلے زمانے کو چھوڑیے۔ ابھی کل کی بات ہے کہ خلافت ایجی ٹیشن کے زمانے میں ہندو، مسلمانوں کے ساتھ شریک ہوکر "اللہ اکبر" کے نعرے لگا چکے ہیں، جو کہ خالص اسلامی نعرہ ہے۔ مہاتما گاندھی اس ایجی ٹیشن کے قائد اعظم تھے۔ ہندؤوں کی یہ رواداری اور مواسات و غمخواری اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ ان کا دل کس قدر کشادہ، حوصلہ کتنا بلند اور ظرف کس درجہ عالی ہے۔

اب میں مسلمانوں کی نمایندگی کرتے ہوے کہتا ہوں کہ مسلم بھائی بھی ہندؤوں کی اس یگانگت و ہمدردی کو فراموش نہیں کر سکتے۔ وہ شکر گزار قوم ہیں، حق پسند ہیں، ان کی رگ رگ میں محمدؐ عربی کے اخلاق کی روح دوڑ رہی ہے، وہ معاشرت و تمدن میں اپنے نبیؐ برحق کی ہدایات کا قدم قدم پر لحاظ رکھتے ہیں۔ وہ نبیؐ برحق، جس کی بزم میں یہود، نصاریٰ اور بت پرست سبھی آتے تھے اور

مسلمانوں کے شانے سے شانہ ملا کر بیٹھتے تھے - اپنے پرائے کا امتیاز بالکل
نہ تھا، بلکہ بسا اوقات حضرت محمدؐ ان یہود و نصاریٰ کے لیے اپنی عبائے مبارک
کا فرش بچھا دیتے تھے - اس سے بھی بڑھ کر رواداری کا یہ عالم تھا کہ جو لوگ،
جھوٹ موٹ کسی ذاتی مفاد کی غرض سے، آنحضرت کی بزم میں آکر شریک
ہوتے تھے اور دھوکا دینے کے لیے مسلمان بن گئے تھے، جن کا ذکر قرآن میں
بھی آیا ہے اور پورا سورۂ مُنافقون انہی کے بارے میں موجود ہے، رسول صلعم
ان کو جانتے اور پہچانتے تھے، مگر آپ نے صرف اپنی وسعت اخلاق سے
مرتے دم تک اپنے صحابہ کو ان لوگوں کے نام و نشان سے آگاہ نہیں کیا۔
میں آج کل سیرتِ نبوی پڑھ رہا ہوں، جو سر ولیم میور نے انگریزی زبان میں
لکھی ہے - اس میں جا بجا رسول مقبولؐ کے اخلاق کا ذکر ہے، جس کو پڑھ کر،
میں بہت خوش ہوا - اُن کی مروت، غمخواری، ہمدردی اور فیاضی فقط دوستوں
کے ساتھ نہیں، بلکہ دشمنوں کے ساتھ بھی بیان کی گئی ہے اور لکھا ہے کہ
اگرچہ اُن کی طبیعت میں بہت پُرشور جذبات تھے، مگر نفس کشی سے وہ اپنے
غصّے کو ایسا فرو کرتے تھے کہ یہ جذبات اوپر کی سطح پر نمایاں نہیں ہونے پاتے
تھے - پس ایسے خلیق نبیؐ کی امت سے سوائے خوش خلقی اور رواداری کے
کبھی ہرگز کسی دوسرے سلوک کی امید نہیں کی جا سکتی -

ہندو مسلم، ہر دو فریق کی رواداری کے جو مظاہرے، ہمارے فرخ آباد
میں ہوتے رہتے ہیں، ان پر نظر کر کے ہم کو اس وسوسۂ باطل کی کوئی گنجائش
باقی نہیں رہتی کہ یہاں کسی قسم کی کشمکش، کبھی پیدا ہو گی - آپ کو یاد ہو گا کہ

اب سے پندرہ سال قبل محرم الحرام اور رام لیلا ایک ہی وقت میں پڑے تھے اور اتفاق سے امام حسینؑ کے سیوم اور بھرت ملاپ کا دن ایک تھا۔ یہاں کے ہندوؤں نے مسلمانوں کے جذباتِ غم کا احترام کرکے، اپنی طرف سے بغیر کسی تحریک کے مسلمان لیڈروں کی خدمت میں کہلا بھیجا کہ اوّل ہم آپ کے یہاں، امام کے تیجے میں شریک ہوں گے، بعدازاں بھرت ملاپ کی رسم ادا کریں گے۔ یہ ہے یہاں کے ہندوؤں کی رواداری۔ اب مسلمانوں کی کیفیت سنیے۔ محرم کے دس دن، سبھی جانتے ہیں کہ مسلمانوں میں سوگ اور ماتمداری ہوتی ہے اور اُن کے گھروں میں، بلکہ دلوں میں بھی، خوشی کے اسباب و لوازم کا گزر نہیں ہوتا، مگر بھرت ملاپ کے مراسم میں علی العموم مسلمانوں نے شرکت کی اور جان و دل سے حصّہ لیا۔ یہ بات تو ہمارے شہر میں ہمیشہ سے ہوتی چلی آئی ہے کہ یہاں کے ہندو، محرم میں جا بجا سبیلیں رکھتے ہیں اور شربت پلاتے ہیں۔ اسی طرح مسلمان ہولی وغیرہ میں ہندو احباب کی تواضع عطر، الائچی اور سگریٹ وغیرہ سے کرتے ہیں اور یہ باہمی سلوک، یہاں عام ہے۔ کسی خاص طبقے سے خصوصیت نہیں رکھتا ——— میں اس موقع پر اپنے مسلمان بھائیوں کو نیز ہندوؤں کو شاہ افغانستان کا ایک قول، جو میں نے اخبار میں پڑھا ہے، سُنانا چاہتا ہوں، جس کو سُن کر آپ بہت خوش ہوں گے۔ شاہ موصوف فرماتے ہیں کہ:۔

"ہندو مسلم، میری داہنی اور بائیں آنکھیں ہیں"

حضرات! میں یقین کرتا ہوں کہ ہمارے ضلع کے اور تمام ہندوستان کے

ہندو اور مسلمان، شاہ ممدوح کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ کو اُن کی توقعات سے زیادہ ثابت کر دکھائیں گے اور جو قوت در پردہ اختلاف پیدا کرنے کی حامی ہے، اُس پر واضح کردیں گے کہ ہندوستان، ایک جسم ہے اور ہم اس کی داہنی، بائیں، آنکھیں ہیں۔ ہم میں کسی قسم کا اختلاف ہرگز ہرگز ممکن نہیں۔

صاحبان ذیشان! اس وقت چونکہ اختلاف کا منحوس لفظ میری زبان پر آگیا ہے، اس لیے اس کے بارے میں بھی چند کلمات کہنے کو جی چاہتا ہے۔ دو پڑوسیوں میں اختلاف کبھی نہیں ہو سکتا، البتہ اُس صورت میں کہ ایک دوسرے کے مقابلے میں خود غرضی کو دخل دے۔ پڑوسیوں کا تو کیا ذکر ہے، اس خود غرضی کی وجہ سے تو بھائی، بھائی کا دشمن بن جاتا ہے۔ پس یہ اختلافات جو فرقہ وارانہ، جا بجا ہوتے رہتے ہیں اسی قسم کی خود غرضیوں پر مبنی ہوتے ہیں، جن کی ہوس میں، دنیا کے حریص وطماع اپنے سگے بھائی کی خونریزی میں بھی دریغ نہیں کرتے۔

ایسے ہی لوگوں کے لیے شاعر نے کہا ہے ؎

بھاگ ان بردہ فروشوں سے کہاں کے بھائی　　بیچ ہی ڈالیں جو یوسفؑ سا برادر پائیں

غرض اس بحث سے یہ ہے کہ ان نزاعات و فسادات کا باعث، مذہب نہیں ہوتا۔ کوئی صاحب، ہندو یا مسلمان، بتائیں کہ ان دونوں میں سے کسی کا مذہب یا دھرم یہ حکم دیتا ہے کہ تم کسی وقت اور کسی حال میں بھی، بنی نوع انسان کا خون بہاؤ؟ نہیں ہرگز نہیں۔ دفاع کے لیے ہر مذہب نے اجازت دی ہے اور اس میں جو خون بہہ جائے، وہ روا بھی ہوتا ہے، مگر خود سے بہیمانہ طور پر حملہ کر دینے کو کوئی مذہب گوارا نہیں کرتا۔ بہر صورت جہاں جہاں، اس قسم کے

جھگڑے آپس میں ہو گئے ہیں یا خدانخواستہ آیندہ ہوں، وہاں کے لوگوں کو مصالحت کی طرف آنا چاہیے اور مصالحت کے وقت ایک گُر یاد رکھنا چاہیے کہ دائمی اور پائدار صُلح اُسی وقت ہوتی ہے، جبکہ متخاصمین کو مساوات کے حقوق مل جائیں۔ پس اگر کسی فرقے کے لیڈر، اپنی اکثریت کی بنا پر، مساوات کے حقوق دوسرے فرقے کو نہ دیں تو یہ اُن کی نادانی ہے اور اس بات کی دلیل ہے کہ وہ مل جُل کر رہنا نہیں چاہتے۔ مساوات بہترین چیز ہے۔ اگر ایک فریق نے اکثریت کے زعم میں دبا کر صلح کرنا چاہی تو اوّل تو یہ صلح ہونا ہی ناممکن ہے اور اگر کسی مصلحت یا مجبوری سے دوسرے فریق نے دب کر صلح کرلی تو وہ دیرپا نہیں ہوگی اور بات بات پر ٹوٹتی رہے گی اور دونوں فریق میں محبت کبھی نہ پیدا ہو سکے گی۔ یاد رکھیے کہ محبت کا اصول ہی برابری ہے۔ ایک بہت بڑا ہے اور دوسرا بہت چھوٹا، تو ان دونوں میں دلی محبت نہیں ہو سکتی۔ سچی اور مستقل محبت اُنہی دو شخصوں یا گروہوں میں ہو سکتی ہے جو باہم برابری رکھتے ہوں یا اُن دونوں میں یہ بات قرار پا جائے کہ ہم ہمیشہ برابری کا برتاؤ کریں گے۔

مجھے امید ہے کہ اگر آپ اس اصول کو ملحوظ رکھیں گے، تو کبھی کسی قسم کا اختلاف پیدا نہیں ہو سکتا۔

حاضرین مشاعرہ کا خیر مقدم

آداب شاعری اور حالات شعراء

۲۸ر اپریل سنہ ۶۲ء کو ایک بزم شاعرہ بمقام مدرسہ مفتی صاحب قرار دی گئی تھی۔ جس میں چند اضلاع کے شعراء شریک ہوے تھے اور میر مجلس ایک رئیس یمن پوری تھے۔ مشران صاحب کو استقبالیہ کمیٹی کی صدارت تفویض کی گئی تھی اور یہ درخواست کی گئی تھی کہ شکریے کی تقریر کے ساتھ ساتھ شعر و شاعری کے موضوع پر بھی کچھ بیان ایسا کیا جائے جو شعراء کے لیے بکار آمد اور اُن کی دلچسپی کا باعث ہو۔ موصوف نے احباب کے اصرار پر انکار مناسب نہ سمجھا اور حاضرین کا خیر مقدم کرنے کے بعد آداب شاعری اور حالات شعراء بیان کیے اور شعرائے ہند و عجم کے کلام کی مخصوص خوبیاں پیش کیں۔ خطبۂ صدارت درج ذیل ہے۔ یہ تقریر ایک گھنٹے سے کچھ زائد عرصے میں ختم ہوئی تھی۔

میر مجلس اور حضرات انجمن!

مجھے یہ خدمت سپرد ہوئی ہے کہ میں بحیثیت صدر استقبالیہ کمیٹی، آپ سب حضرات کی سپاس گزاری کروں، جنھوں نے اپنے قدوم سے اس بزم سخن کو زیب و زینت بخشی ہے۔ مجھ سے میرے دوستوں نے جب صدارت کی

درخواست کی تو مجھے بہت تامل ہوا کیونکہ میں جانتا تھا کہ اس کام کے لیے میں موزوں نہیں ہوں ؎

نہ ہر کس سزاوار باشد بصدر صدارت بجا است، و منزل بقدر

مجھے یہ بھی خیال تھا کہ میں شاعر نہیں ہوں اور بزم مشاعرہ میں نثاری معمول کے خلاف معلوم ہوتی ہے لیکن میرے دوستوں نے اصرار کیا اور فرمایا کہ تمھاری نثر میں نظم بھی ہوتی ہے اور شعر و سخن کے موضوع پر بھی تم ضرور کچھ کہو تاکہ شعراء کو دلچسپی ہو اور صحبت مشاعرہ بکار آمد ہو۔ مجھ کو بجز منظور کرنے کے کوئی چارہ نہ تھا۔ لہذا بمفحوائے "المامور معذور" آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ میں کمیٹی کی طرف سے آپ سب مہمانان عظیم الشان کا شکریہ ادا کرتا ہوں جن کی تشریف آوری سے ہم کو فخر حاصل ہوا ہے۔ جو صاحبان غیر اضلاع سے تشریف لائے ہیں، وہ ہمارے خاص شکریے کے مستحق ہیں۔ ہم اپنے مہمانوں کی شان کے لائق آسائش و مہمانداری کا انتظام کرنے سے قاصر رہے ہیں، اس کی ایک وجہ تو ضیق وقت ہے، دوسری وجہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں جو لوگ زیادہ کام کرنے والے ہیں وہ اتفاق سے اس وقت اپنے مشاغل کو چھوڑ نہ سکے۔ تاہم ہم نے کوشش کی ہے کہ حتی الوسع آپ سب مہمانان ذیشان کی خدمت گزاری کر سکیں اور ہم کو پوری اُمید ہے کہ حالات موجودہ پر نظر کر کے آپ سب حضرات ہماری فروگزاشتوں کو معاف فرمائیں گے۔

شعر و شاعری کی عظمت

اب میں دوستوں کی فرمائش کی تعمیل میں شعر و سخن کا ذکر کروں گا۔ واضح ہو کہ زمانۂ قدیم سے اب تک

شعر کی عظمت کو سب نے تسلیم کیا ہے ۔ عرب میں یہ حالت تھی کہ شاعر کسی قبیلے میں پیدا ہوتا تھا تو جا بجا سے سفارتیں آتی تھیں جو اُس کو مبارکباد دیتی تھیں اور تمام خاندان میں بڑی خوشی منائی جاتی تھی اور تمام قبیلہ معزز سمجھا جاتا تھا اور اُس قبیلے کی عورتیں جمع ہو کر فخریہ گیت گاتی تھیں اور خوشی کے جلسے ہوا کرتے تھے ۔ شاعر کا اقتدار ایسا بڑھا ہوا تھا کہ جس کو چاہتا تعریف کر کے آسمان کا تارہ بنا دیتا اور جس کو چاہتا ہجو کے ذریعے عرش سے فرش پر گرا دیتا ہے

یکے را زمہ اندر آرد بچاہ	دگر راز چہ بر فرازد بماہ

ایک شخص گمنام تھا۔ اُس کی تین بیٹیاں تھیں جن کو بر نہیں ملتا تھا۔ اتفاق سے ایک شاعر اُس کے یہاں آکر مہمان ہوا ۔ جب شراب کا دَور چلا، تو شاعر نے میزبان کے اہل و عیال کا حال پوچھا ۔ اُس نے کہا کہ میری تین بیٹیاں ہیں اور جوان ہو گئی ہیں ۔ کہیں سے اب تک شادی کا پیام نہیں آیا ہے۔ شاعر بولا خاطر جمع رہو، میں نے اس کا انتظام کر دیا ہے ۔ جب عکاظ کے میلے کے دن آئے تو اُس شاعر نے مجمع عام میں ایک قصیدہ پڑھا، جس میں اُس میزبان کے خاندان کی تعریف تھی ۔ قصیدہ ختم نہیں ہونے پایا تھا کہ اُس کے میزبان کے گرداگرد لوگ جمع ہو گئے اور تینوں لڑکیاں معزز خاندانوں میں پہونچ گئیں ۔

ایک شاعر کو کسی معزز قبیلے سے رنج پہونچا ۔ اُس نے اُس کے آباؤ اجداد کی ہجو کی ۔ جس کا اثر یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ اُس قبیلے کی ذلت اس قدر بڑھی کہ وہ نہایت گمنام ہو گیا اور اوج کمال سے پستی زوال میں گرا ۔ یہاں تک کہ

نام و نشان بھی مٹ گیا ۔

عجم میں بھی یہی حال تھا ۔ فردوسی نے سلطان محمود کی ہجو کہی ۔ سب جانتے ہیں کہ محمود کس سطوت و جبروت کا بادشاہ تھا ۔ اُس نے منادی کرادی تھی کہ ہجو جس کسی کے یہاں نکلے گی وہ سزا پائے گا ۔ لیکن ہجو کے اشعار بچّے بچّے کی زبان پر چڑھ گئے تھے ۔ نو سو برس سے اس وقت تک جس قدر نسخے شاہنامے کے دنیا میں شائع ہوے ہجو سے کوئی خالی نہیں ۔ گویا ہجو شاہنامے کا جزوِ لاینفک ہوگئی ہے اور ہمیشہ رہے گی، بقول فردوسی ؂

چو شاعر برنجد بگوید ہجا ‌ ‌ ‌ ‌ بماند ہجا تا قیامت بجا

ہندوستان میں بھی شعراء کی بڑی وقعت تھی اور ہے ۔ سیکڑوں شاعروں نے لاکھوں روپیے انعام میں پائے ۔ چنانچہ مشہور ہے کہ خسرو دہلوی نے فیل بار سونا انعام میں پایا ۔ ایک مرتبہ محمد تغلق کے دربار میں مولانا جمال الدین پایہ تخت کے شاعر نے مبارکباد کا قصیدہ پڑھا، جس کا مطلع یہ تھا ؂

الٰہی تا جہاں باشد نگہدار ایں جہاناں را ‌ ‌ ‌ ‌ محمد شاہ تغلق ابن تغلق ابن سلطاں را

بادشاہ نے سُن کر کہا کہ بس مولانا میری مجال نہیں ہے کہ ایک شعر سے زیادہ کا صلہ میں دے سکوں ۔ یہ کہکر خزانچی کو حکم دیا کہ روپیوں کی تھیلیاں شاعر کے گرد و پیش لگادی جائیں، یہاں تک کہ شاعر کے سر تک پہونچ جائیں ۔ چنانچہ اُسی وقت تھیلیاں گرد و پیش لگادی گئیں ۔ جب شاعر کے سر تک پہونچیں مولانا کھڑے ہوگئے ۔ یہ ادا بادشاہ کو بہت پسند آئی حکم دیا کہ شاعر کو کھڑا رہنے دو اور تھیلیاں اُس کے سر تک لگا دو ۔ غرضکہ ایک ہی شعر کے صلے میں شاعر

تین پشت تک مالدار ہو گیا - جب فتح علی شاہ قاچار والی ایران نے روس کے مقابلے میں فتح پائی تو قاآنی نے قصیدہ تہنیت کا پیش کیا - قاآنی اُس وقت دربار کا ملک الشعراء تھا اور ختم الشعراء اُس کا لقب تھا - جب پڑھتے پڑھتے اس شعر پر پہونچا ؎

آں قدر نصرانیاں راکشت در روزِ نبرد   عیسیٰ دوراں بہ گردوں دست پیغمبر گرفت

تو بادشاہ نے فقط اس ایک شعر کا صلہ بیس ہزار روپیہ دیا - یہی حال ابراہیم عادل شاہ اور برہان نظام شاہ والیان بیجا پور کی قدر دانی کا تھا کہ ملا نورالدین ظہوری کی اس قدر و منزلت کی کہ اُس نے کبھی دربار مغلیہ کی طرف رخ نہیں کیا - عرفی کو دیکھیے کہ اُس نے ابوالفتح گیلانی اور خانخاناں کے سوا امرائے دربار میں سے کسی کی آستاں بوسی نہیں کی - ان دونوں قدر دانان شعر و سخن کے دربار دُربار سے عرفی عمر بھر فیض پاتا رہا - سلاطین مغلیہ کے وقت میں ایران کے بڑے شعراء اپنا وطن مالوف چھوڑ کے ہندوستان کھنچے ہوے چلے آئے اور اہل کمال نے ان سلاطین کے آستانے کو اپنا قبلۂ حاجت قرار دیا اور سلاطین خود ان شاعروں کو اپنے دربار کی زیب و زینت سمجھتے رہے -

صاحبو! میں نے شعر و شاعری کی عظمت اور قدر و منزلت آپ کی خدمت میں عرض کی - اب میں شعر کی حقیقت مختصراً عرض کروں گا اور ایشیا اور یورپ کے اہل کمال کے جو خیالات شعر کی حقیقت کے بارے میں ہیں، وہ بیان کروں گا -

شعر کی ماہیت اور حقیقت

اس موضوع پر سب سے پہلے ارسطو نے کتاب لکھی، جس کا نام بوطیقا ہے - وہ کہتا ہے

کہ شعر ایک قسم کی مصوری یا نقالی کا نام ہے۔ صرف فرق یہ ہے کہ مصور مادّی چیزوں کی تصویر کھینچتا ہے اور شاعر ہر قسم کے جذبات اور خیالات کی تصویر کھینچ سکتا ہے۔ اس بنا پر جب کسی چیز کا بیان اس طور پر کیا جائے کہ ہو بہو تصویر آنکھوں کے سامنے آ جائے تو اُس پر شعر کی تعریف صادق آ جائے گی۔ ارسطو کی اس تصنیف کا ترجمہ عربی زبان میں ہوا اور ابن رشیق نے جو بہت بڑا فلسفی گزرا ہے اُس کا خلاصہ کیا۔ مسلمانوں نے ارسطو کی ادبی تصنیفات کی طرف التفات نہیں کیا، اس لیے شاعری کی نسبت جو خیالات ارسطو کے تھے وہ مسلمانوں میں پھیل نہ سکے۔

ادب کی کتابوں میں جو تعریفِ شعر کی گئی ہے وہی خاص و عام کی زبانوں پر جاری ہے۔ یعنی یہ کہ کلام موزوں ہو اور متکلم نے بالارادہ موزوں کیا ہو۔ جس سے مطلب یہ نکلتا ہے کہ اگر کوئی شخص کوئی جملہ کہے جو اتفاق سے بطور نظم بھی کہا جا سکے تو اُس پر مصرع کا اطلاق نہ ہوگا اور وہ شعر کا جزو نہ سمجھا جائے گا۔ مثلاً کوئی کہے کہ "ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے" یہ موزوں بھی ہو سکتا ہے۔ تین الفاظ آرسی، کیا، ہے، اگر بڑھا کر پڑھے جائیں تو پورا مصرع موزوں ہو جائے گا۔ اگر گھٹا کر پڑھے جائیں تو نثر ہے۔ مگر یہ عامیانہ تعریف ہے۔ شاعری صرف وزن اور قافیے کا نام نہیں ہے۔

ایران کے شاعروں کے نزدیک شاعری دراصل تخیل کا نام تھا۔ نظامی عروضی سمرقندی نے جو بہت بڑا شاعر گزرا اپنی کتاب چہار مقالہ میں شاعری کی تعریف جو لکھی ہے اُس کا نتیجہ یہ ہے کہ شاعری اس کا نام ہے کہ کسی مضمون کو

خیال میں ایسا ترتیب دیا جائے کہ اچھی چیز بدنما اور بُری چیز خوشنما ثابت ہو جائے، جس سے محبت اور غصّے کی طاقتیں بھڑک اُٹھیں۔ یہ تو ایشیا کے پُرانے قول اور خیالات شعر اور شاعری کی نسبت تھے۔ یورپ والوں نے بہت باریک بحثیں کی ہیں۔ اور عجیب و غریب نکتے پیدا کیے ہیں۔

جان اسٹوارٹ مِل نے ایک مطول مضمون لکھا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کے مدرکات میں سے بعض ایسے ہیں کہ جن سے انسانی جذبات کو کچھ تعلق نہیں۔ مثلاً اگر ہم اقلیدس کا کوئی سوال حل کریں تو اس سے ہم کو غصّہ یا خوشی یا رنج پیدا نہ ہوگا۔ لیکن اگر ہمارے سامنے کسی کی مصیبت و تکلیف کا حال دردبھرے لفظوں میں بیان کیا جائے تو اُس سے ہم پر اثر ہوگا۔ اس قسم کے اثروں کو جذبات یا احساسات کہتے ہیں اور جو چیز ان کو بھڑکاتی ہے اُس کا نام شاعری ہے۔ اس تعریف کی بنا پر تصویر، تقریر اور وعظ وغیرہ بھی بعض لوگوں کے نزدیک شاعری میں داخل ہیں کیونکہ یہ چیزیں انسانی جذبات کو بھڑکاتی ہیں۔ لیکن مل صاحب کے نزدیک یہ چیزیں یعنی تصویر وغیرہ شاعری کے دائرے سے باہر ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ انسان جو کلام کرتا ہے اُس کی غرض کبھی تو یہ ہوتی ہے کہ دوسروں پر اثر ڈالے، جیسے بذریعہ لکچر اسپیچ وغیرہ کے۔ کبھی وہ رنج یا خوشی کے موقع پر خود اپنے آپ سے خطاب کرتا ہے، مثلاً کسی شخص کا بیٹا مر جائے تو جو بھی الفاظ، زبان سے نکلیں گے اُن سے یہ غرض نہ ہوگی کہ وہ کس شخص یا جماعت سے خطاب کرتا ہے۔ بلکہ وہ خود اپنے آپ سے بات کرتا ہے۔ فرض کیا جائے کہ وہاں

کوئی شخص موجود نہ ہو تب بھی اُس کی زبان سے وہی الفاظ نکلیں گے۔ شاعری اسی قسم کے کلام کا نام ہے۔ اس بنیاد پر شاعری کی منطقی تعریف یہ ہوگی کہ جو کلام اس قسم کا ہو کہ اُس سے انسانی جذبات بھڑک اُٹھیں اور اُس کا مخاطب حاضرین نہ ہوں بلکہ انسان خود ہی اپنا مخاطب ہو تو اُس کا نام شاعری ہے۔

مِل صاحب نے اگرچہ بہت باریک بات کہی ہے لیکن شاعری کا دائرہ اُس سے بہت تنگ ہو جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شاعری کا دائرہ نہ تو اس قدر تنگ ہے جیسا کہ مِل صاحب کرنا چاہتے ہیں، نہ اس قدر وسیع ہے جیسا کہ ایشیا کے عالموں نے کیا ہے۔ شعر کی اصلی حقیقت یہ ہے جیسا کہ ارسطو نے کہا ہے کہ وہ ایک قسم کی مصوری یا نقالی ہے۔ فرق یہ ہے کہ مصور صرف مادّی اشیاء کی تصویر کھینچ سکتا ہے اور شاعر ہر قسم کے خیالات اور جذبات کی تصویر کھینچ سکتا ہے۔ اس بنا پر کسی چیز کا بیان جب اس طرح کیا جائے کہ اُس چیز کی اصلی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جائے تو اُس پر شعر کی تعریف صادق آجائے گی۔ مثلاً دریا کی روانی، جنگل کا سناٹا، باغ کی شادابی، سبزے کی لہک، پھولوں کی مہک، شبنم کی جھلک، ہوا کے جھونکے، دھوپ کی حدت، گرمی کی شدّت، جاڑے کی فسردگی، صبح کی شگفتگی، شام کی دلآویزی، یا رنج، غم، خوشی، غصہ، محبت، افسوس، حسرت، ان چیزوں کا بیان اس طرح کرنا کہ اُن کی صورت آنکھوں کے سامنے پھر جائے، یہی شاعری ہے۔

شاعری کی تعریف اور ایک طرح بھی کی جاسکتی ہے۔ دنیا میں جس قدر چیزیں ہیں خواہ وہ مادّی ہوں جیسے پہاڑ، دریا، جنگل، باغ وغیرہ یا وہ

غیر مادی ہوں مثلاً تعریف، نفرت، محبت، غصہ، امید، نا امیدی، رنج، خوشی۔ ان سب کا دل پر اثر پڑتا ہے، لیکن یہ اثر کم یا زیادہ ہوتا ہے۔ بعض پر کم بعض پر زیادہ۔ پس جو شخص ان قدرتی چیزوں اور کیفیتوں سے عام لوگوں کی نسبت زیادہ اثر قبول کرے اور اپنے الفاظ سے دوسروں پر بھی زیادہ اثر ڈال سکے، وہی شاعر ہے۔ مولوی حمید الدین نے فن بلاغت میں ایک کتاب لکھی ہے۔ اُس میں شعر کی حقیقت یوں بیان کی ہے کہ شاعر کے لفظی معنی ہیں صاحب شعور۔ شعور اصل میں احساس کو کہتے ہیں جس کو انگریزی میں فیلنگ کہتے ہیں۔ یعنی شاعر وہ ہے جس کا احساس تیز ہو۔ انسان پر خاص خاص حالتیں طاری ہوتی رہتی ہیں جیسے رونا، ہنسنا، انگڑائی لینا وغیرہ۔ یہ حالتیں جب انسان پر غالب ہوتی ہیں تو اُس سے خاص خاص حرکتیں صادر ہوتی ہیں۔ رونے کے وقت آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔ ہنسی کے وقت ایک خاص آواز پیدا ہو جاتی ہے۔ انگڑائی کے وقت بدن تن جاتا ہے۔ اسی طرح شعر بھی ایک خاص حالت کا نام ہے۔ شاعر کی طبیعت پر رنج یا خوشی یا غصے کے وقت ایک خاص اثر پڑتا ہے اور یہ اثر موزوں الفاظ کے ذریعے ظاہر ہوتا ہے۔ اسی کا نام شاعری ہے۔ ان خیالات سے سامعین کو شاعری کی حقیقت کا کچھ اندازہ ہوا ہو گا اور معلوم ہوا ہو گا کہ آج کل جس چیز کا نام شاعری ہے اُس کو شاعری سے کچھ تعلق نہیں۔ یہ تو شعر کی تعریف عرض کی گئی۔ اب شعر کے اجزاء اور عناصر کا حال سُنیے۔

شعر کے دو اجزاء ہیں۔ مادہ اور صورت۔ مادّے سے غرض ہے مضمون۔ یعنی کیا کیا بیان کیا جائے۔ صورت سے غرض یہ ہے کہ طرز ادا کیا ہو۔ شاعری کے

اصلی عناصر دو ہیں - محاکات اور تخئیل - باقی سلاست اور بندش اور عمدہ ترکیبیں اور صنائع بدائع زیب و زینت اور نقش و نگار کا کام دیتے ہیں - انسان کے دل میں جو جذبات پیدا ہوتے ہیں جیسے خوشی، رنج، غصہ، آرزو، تعجب، فخر وغیرہ اُن کا ادا کرنا یا مناظر قدرت مثلاً باغ، جنگل، پہاڑ، بہار، خزاں، صبح، شام، ان کی تصویر کھینچنا شاعری کے اصلی عناصر ہیں -

محاکات کی تعریف یہ ہے کہ شاعر کسی چیز کا بیان ایسا کرے کہ جو اثر اُس کی طبیعت میں ہو، وہی دوسروں کی طبیعت میں پیدا کر دے یا یہ کہ اُس چیز کی تصویر آنکھوں کے سامنے آ جائے - تخئیل اُس قوت کو کہتے ہیں جس سے ایجاد و اختراع کا کام لیا جائے یا کوئی مسئلہ فلسفے کا حل کیا جائے - یا اگر کوئی شئے ہمارے عالمِ خیال میں ہو اُس کو ہماری نظر کے سامنے لے آئے - یہی قوت تخئیل شاعری میں مضامین بلند پیدا کرتی ہے - محاکات کا دوسرا نام مرقع نگاری ہے - مثنوی لکھنے میں مرقع نگاری سے کام زیادہ لیا جاتا ہے، کیونکہ اُس میں مسلسل واقعات کا بیان ہوتا ہے اور استعارہ اور صنائع بدائع محاکات میں خلل انداز ہوتے ہیں - بخلاف غزل یا قصیدے کے کہ اُس کا ہر شعر جدا جدا مضمون رکھتا ہے اور استعارہ یا صنائع بدائع کے استعمال کی گنجائش بہت زیادہ ہوتی ہے - فردوسی نے شاہنامے میں اعلیٰ درجے کی مرقع نگاری کی ہے - وہ واقعات کا بیان نہایت سادہ کرتا ہے اور استعارے کے پاس کبھی نہیں پھٹکتا - بخلاف اس کے نظامی نے مثنوی (سکندر نامہ) میں مرصع نگاری سے زیادہ کام لیا تو واقعات کی تصویر کھینچنے سے قاصر رہے ہیں - ایک مثال کے

ذریعہ کمند اندازی کا واقعہ دونوں شاعروں کا دکھاتا ہوں۔ نظامی فرماتے ہیں ؎

کمند عدو بند را شہریار   بینداخت چوں چنبر روزگار

کمند کے ساتھ 'عدو بند' کے الفاظ بہت خوب ہیں۔ بندش چست ہوگئی۔ 'چنبر روزگار' بھی خوب استعارہ ہے۔ لیکن غور کیجیے قباحت یہ ہوگئی کہ سننے والے کی توجہ 'کمند عدو بند' اور 'چنبر روزگار' کی طرف زیادہ تر مصروف رہی، کمند پھینکنے کا واقعہ نظر سے بالکل چھپ گیا۔ یہ نہ معلوم ہوا کہ کمند پھینکنے کا نتیجہ کیا ہوا۔ کوئی اس میں پھنسا یا نہیں۔ بخلاف اس کے، فردوسی جو رزم کا دھنی ہے کہتا ہے ؎

چو از دست رستم رہا شد کمند   سر شہریار اندر آمد بہ بند

زپیل اندر آورد و زد بر زمیں   بہ بستند بازوئے خاقان چیں

فردوسی نے چار مصرع کہے ہیں اور ہر مصرع میں ایک مضمون علاحدہ ہے جو اُس مصرع میں پورا پورا ادا ہوگیا۔ پہلے مصرع میں شاعر کہتا ہے کہ رستم نے کمند پھینکی۔ دوسرے میں بیان کرتا ہے کہ بادشاہ کا سر پھنس گیا۔ تیسرے میں بتاتا ہے کہ جھٹکا دے کر ہاتھی سے اُس کو نیچے گرالیا۔ اور چوتھے میں کہتا ہے کہ پھر مُشکیں کس لیں۔ ہر مصرع میں ایک واقعہ پورا بیان کردیا۔ اس کے علاوہ بڑی خوبی یہ ہے کہ واقعات کی تدریجی رفتار دکھادی۔ پہلے کمند ڈالی گئی۔ اُس کے بعد گردن پھنسی۔ اُس کے بعد ہاتھی سے نیچے گرایا گیا۔ آخر میں مُشکیں کسی گئیں۔ اگر اس سلسلے اور ترتیب میں فرق آتا تو اُسی قدر مرقع نگاری کا معیار گھٹ جاتا۔ اسی طرح تیر اندازی کا واقعہ بیان کرنے میں فردوسی نے جو مرقع نگاری کی ہے وہ لاجواب ہے۔ کوئی شاعر نہ کرسکا۔ کہتا ہے ؎

تہمتن بہ بند کمر بُرد چنگ — گزیں کرد یک چوبہ تیر خدنگ
خدنگے برآورد پیکاں چو آب — نہادہ برو چار پرّ عقاب
بمالید چاچی کماں را بدست — بہ چرم گوزن اندر آورد شست
ستوں کرد چپ را و خم کرد راست
خروش از خم چرخ چاچی بخاست

ان اشعار کی خوبی بیان کی محتاج نہیں ۔ فطرت کے قاعدے سے جو واقعات یکے بعد دیگرے ہونا چاہیے، اُسی طرح اُن کا بیان کیا گیا ہے ۔ یعنی پہلے رستم کمر کی طرف ہاتھ لے گیا کہ ترکش سے تیر نکالے ۔ پھر اُس نے ترکش میں ہاتھ ڈال کر تیر کا انتخاب کیا کہ حسب موقع تیر نکالوں ۔ اُس کے بعد تیر چُن کر نکالا ۔ کیونکہ تیر کی بھی اقسام ہوتی ہیں ۔ اب شاعر کا فرض تھا کہ دکھائے کہ وہ تیر کس شکل کا تھا ۔ بتاتا ہے کہ اُس کی نوک نہایت تیز اور آبدار تھی اور سوفاریں چار پر عقاب لگے ہوے تھے ۔ پھر کمان ہاتھ میں لی ۔ اُس کے بعد شست باندھی ۔ کمان کھینچنے اور شست باندھنے میں جو مخصوص حالت ہوتی ہے یعنی یہ کہ بایاں ہاتھ سیدھا کیا جاتا ہے اور داہنے ہاتھ کو خم کیا جاتا ہے، بعینہ وہی تصویر چوتھے شعر میں کھینچ دی ۔ کمان تنومند آدمی کھینچتا ہے تو کمان چرچراتی ہے ۔ یہ سب جزئیات بیان کیے گئے ہیں جن سے واقعہ نظر کے سامنے آگیا ہے ۔ چوتھا شعر محاسن شعری کے لحاظ سے لاجواب ہے ۔ چپ و راست، ستوں کردن، چرخ چاچی، یہ الفاظ اور اصطلاحات اور اس پر بندش کی چستی اور صفائی، یہ خوبیاں مذاق سلیم رکھنے والے سمجھتے ہیں ۔ آج تک کسی شاعر نے تیر کھینچنے کی مخصوص حالت اس حسن و خوبی سے بیان

نہیں کی - صرف مصرع اول میں تصویر کھینچی ہے اور دوسرے مصرع میں دوسرا واقعہ جو مصرع اول کا نتیجہ ہے بیان کر دیا ہے - یعنی کمان کا چرچرانا - فردوسی نے تیر مارنے کے اس قدر جزئیات بیان کیے کہ نو شعر کے بعد کہا کہ دشمن تیر کھا کر ہلاک ہوا - دوسرا کوئی شاعر اس واقعے کو لکھتا تو ایک یا دو شعر میں ختم کر دیتا کیونکہ وہ جزئیات میں نہیں جا سکتا تھا - جزئیات میں جانا قادر الکلامی پر دلیل ہے - انہی اشعار میں دو شعر اور آپ کے سننے کے قابل ہیں ؎

چو زد تیر بر سینۂ اشکبوس سپہر آں زماں دست او داد بوس
قضا گفت گیر و قدر گفت دہ ملک گفت احسن فلک گفت زہ

جب ہم شکار کھیلنے جاتے ہیں تو ہمارے ساتھ اکثر دوست احباب اور نوکر چاکر بھی ہوتے ہیں اور اِدھر اُدھر گاؤں کے لڑکے شکار کھانے یا سیر و تفریح کی غرض سے ساتھ ہو لیتے ہیں - جب ہمارے نشانے سے شکار گرتا ہے تو دوست اپنی شایستہ زبان میں داد دیتے ہیں کہ واہ کیا نشانہ لگا ہے - سبحان اللہ، واہ واہ کیا کہنا! لیکن دیہاتی دوسری طرح داد دیتے ہیں - وہ کہتے ہیں کہ وہ مارا وہ گرا، جانے نہ پائے، بھاگنے نہ پائے، پکڑو وغیرہ - شاعر نے دونوں طرح کی داد تیر انداز کی بیان کی ہے - یعنی آسمان نے اُس کے ہاتھ چوم لیے، پھر آسمان اور فرشتوں نے احسنت و مرحبا کہا - لیکن قضا نے کہا کہ پکڑو جانے نہ پائے۔

مصوّر مادّی چیزوں کی تصویر خوب دکھا سکتا ہے بلکہ بعض جذبات کو بھی بذریعہ تصویر نظر کے سامنے لا سکتا ہے، مثلاً ہنسی، خوشی، غم، رونا، تعجب، مایوسی، غصّہ، دیوانگی وغیرہ اور شاعر کے مقابلے میں زیادہ کامیاب ہو سکتا ہے۔

شاعر جن یا دیو کی تعریف میں کہتا ہے ؎

دانت اُس کے بتھے گورکن قضا کے　　دو نتھنے رہِ عدم کے ناکے

زنبور سیاہ خال اُس کے　　برگد کی جٹائیں بال اُس کے

اگر کوئی اچھا مصوّر دیو یا جن کی تصویر کھینچنے میں اُس کے دانت اور بال اور خال ایسے ہی دکھائے جیسے کہ الفاظ کے ذریعے بیان کیے گئے ہیں تو یقیناً اُس تصویر کو دیکھ کر ہم زیادہ حظ اُٹھائیں گے ۔ یا شاعر کہتا ہے ع

شتر لب غول منظر خوک دنداں خرس پیشانی

اگر مصوّر لب اور دانت اور پیشانی اسی طرح دکھا دے جیسی بذریعہ الفاظ بیان کی گئی ہے تو یقیناً زیادہ لطف آئے گا۔ لیکن بیشتر گوناگوں، واقعات، واردات اور حالات ایسے ہوتے ہیں جن کو دکھانے سے مصوّر قاصر ہے اور شاعر ہی بذریعہ الفاظ دکھا سکتا ہے اور اُن کا بیان کرنے میں پورا کامیاب ہو سکتا ہے مثلاً نظامی کہتا ہے ؎

نسب نامۂ دولتِ کیقباد　　ورق بر ورق ہر سوے برد باد

شاعر کو یہ دکھانا منظور ہے کہ دارا کے مرنے سے تمام خاندان کیانی کا خاتمہ ہو گیا اور نسل کیانی برباد ہو گئی اور اُس کا شیرازہ بکھر گیا ۔ شاعر عالم خیال میں یہ بات دیکھ رہا ہے اور دکھانا چاہتا ہے ۔ اس عالم خیال کی تصویر مصوّر کی طاقت سے باہر ہے ۔

صاحبو! میں شعراے عجم و عرب کے کلام سے مثالیں لا رہا ہوں۔ مجھے چاہیے کہ فردوسی ہند حضرت انیسؔ کے کلام بلاغت نظام سے مرقع نگاری اور محاکات کی

مثالیں عرض کروں ۔ کہتے ہیں :۔

دو دن سے بیزباں پہ جو تھا آب و دانہ بند　　دریا کو ہنہنا کے لگا دیکھنے سمند
ہر بار کانپتا تھا سمٹتا تھا بند بند　　چمکارتے تھے حضرت عباسؑ ارجمند

تڑپاتا تھا جگر کو جو، شور آبشار کا
گردن پھرا کے دیکھتا تھا مُنہ سوار کا

یہ وہ موقع ہے کہ حضرت عباسؑ علمبردار نہر فرات سے پانی لینے گئے ہیں ۔ چونکہ اہل بیتؑ کئی روز سے پیاسے تھے، گھوڑا بھی دو روز سے پیاسا ہے ۔ اُنھوں نے اپنی مشک پانی سے بھرلی ہے تاکہ پانی لاکر اہل بیتؑ کو دیں ۔ خود پانی نہیں پیتے ہیں اور نہ گھوڑے کو پلاتے ہیں ۔ گھوڑے نے حالتِ تشنگی میں نہر کو دیکھا تو اپنی فطرت کے مطابق ہنہنانے لگا ۔ وہ اپنے شہسوار کے ارادے سے واقف ہے کہ مجھے وہ پانی نہ پینے دے گا ۔ گھوڑا عربی النسل مالک کا اطاعت شعار و وفادار ہے ۔ لیکن ایک طرف تو اُس کو پیاس بے چین کر رہی ہے دوسری طرف آقا اُس کو روک رہا ہے تو اُس بیچارے بے زبان کی یہ حالت ہو رہی ہے کہ بار بار کانپتا ہے اور اُس کا بند بند سمٹ رہا ہے ۔ پیاس کی حالت میں جو حالت گھوڑوں پر طاری ہوتی ہے، اُس کا فطری منظر دکھایا ہے ۔

واضح ہو کہ محاکات یا مرقع نگاری بجائے خود ایک لطف انگیز چیز ہے ۔ یعنی کسی چیز کا بیان ایسا کرنا کہ وہ نظر کے سامنے آجائے یا اُس کی تصویر بذریعہ قلم کے کھینچ دی جائے، یہ فطرۃً انسان کو مرغوب ہے ۔ چاہے وہ چیز اچھی ہو یا بُری ہو ۔ ایک حبشی یا زنگی جو مردم آزار بلکہ مردم خوار ہو اور جس کا حال یہ ہو کہ ۔ ع

لب خرس کے، منہ خوک کا، لنگور کی گردن

اور وہ ہمارے سامنے یا ہمارے پاس آکر بیٹھ جائے تو طبیعت کو نہایت کراہت ہوگی اور اُس کا بیٹھنا ہم کو نہایت ناگوار ہوگا۔ لیکن اگر اُسی کی تصویر ہو بہو کھینچ کر کوئی ہمارے پاس لے آئے تو ہم اُس کو دیکھ کر نہایت پسند کریں گے اور مصور کی صنعت کی نہایت تعریف کریں گے۔ اسی طرح شعر میں بذریعہ محاکات و مرقع نگاری جس چیز کا منظر دکھایا گیا ہے اُسے ہم پسند کریں گے، چاہے وہ ناگوار یا خوشگوار چیز کا ہو۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ شعر اگر اچھا ہو تو ضرور وہ ایک مؤثر چیز ہے۔ جس طرح شعر بوجہ محاکات کے پسند ہے اسی طرح شعر بوجہ موسیقیت کے بالطبع پسند ہے۔ یعنی شعر میں جتنا زیادہ جزو موسیقی کا ہوتا ہے اُسی قدر زیادہ موثر اور دل پسند ہوتا ہے۔ کیونکہ موسیقی بجائے خود بہت دل پسند اور موثر چیز ہے۔

مصور بذریعہ تصویر زیادہ سے زیادہ وہ اثر پیدا کر سکتا ہے جو اُس چیز کے دیکھنے سے پیدا ہوتا۔ لیکن شاعر باوجودیکہ کبھی کبھی تصویر کا ہر جزو نمایاں نہیں کرتا مگر اپنے الفاظ سے اُس سے زیادہ اثر پیدا کرتا ہے جو خود اُس چیز کے دیکھنے سے پیدا ہوتا۔ آپ جنگل میں جاتے ہیں سبزے پر اوس پڑی ہوئی دیکھتے ہیں، اُس کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ شاعر اپنے شعر کے ذریعے آپ پر ایک نیا اثر پیدا کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے ؎

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا — تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا

یا — ہوا بر سبزہ ہا گوہر گسستہ — زمرد را بمروارید بستہ

زمرد سے مراد سبزہ اور گوہر سے مراد شبنم کے قطرے، اوس جو سبزے پر پڑی ہے،

شاعر کہتا ہے کہ موتی اور زمرد ایک ہی لڑی میں ٹکے ہوئے ہیں -

اسی طرح آپ باغ میں جاکر گلاب کے پھول دیکھتے ہیں اور کانٹے بھی اور سبزہ بھی - یہ خوشنما چیزیں آپ کی نظر کو خوش کرتی ہیں - لیکن شاعر اپنے شعر سے آپ کے دل میں ایک نیا خیال پیدا کرتا ہے - چنانچہ شمیم امروہوی شاعر دربار ریاست رامپور کہتے ہیں ؎

کانٹے بھی تر زباں ہیں شگوفہ نیا یہ ہے ۔ سبزے کے حسن میں بھی نمک سے مزا یہ ہے

اسی طرح شاعر عالم خیال میں ایک منظر دکھاتا ہے جو مصور بذریعہ تصویر دکھانے سے قاصر ہے - کہتا ہے ؎

مثل آئینہ ہے اس رشک قمر کا پہلو ۔ صاف اِدھر سے نظر آتا ہے اُدھر کا پہلو

آپ کی ضیافت طبع کے لیے دو تین بند حضرت انیس کے اور عرض کروں جن میں مرقع نگاری کا کمال دکھایا ہے اور مرصع نگاری کی بھی جھلک ہے - گرمی کا سماں دکھاتے ہیں تو فرماتے ہیں ؎

وہ گرمیوں کے دن وہ پہاڑوں کی راہ سخت ۔ پانی نہ منزلوں نہ کہیں سایۂ درخت
ڈوبے ہوے پسینے میں تھے غازیوں کے رخت ۔ سونلا گئے تھے رنگ جوانان نیک بخت
راکب عبائیں چاند سے چہروں پہ ڈالے تھے
توسنے ہوے سمند زبانیں نکالے تھے

اس بند میں وہ تمام جزئیات موجود ہیں جو گرمی کا سماں دکھانے کے واسطے ضروری تھے - یعنی پہاڑی راستے پر چلنے سے جو مسافروں کو تکلیف ہوا کرتی ہے - پانی اور سایے کا نہ ہونا اور سواروں کا پسینے میں تر ہونا، اُن کے رنگ سونلا جانا، بوجہ

تمازت آفتاب کے چہروں پر عباؤں کا ڈال لینا، گرمی اور پیاس سے گھوڑوں کا زبان نکال دینا، یہ سب معمولی واقعات ہیں جو گرم ملک کے سفر میں کم و بیش پیش آتے ہیں۔ رزم کا سماں ملاحظہ فرمائیے ؎

ہر صف میں برچھیاں بھی ہزاروں لچکتی تھیں   نوکیں وہ تیز تھیں کہ دلوں میں کھٹکتی تھیں
نیزے تُلے ہوئے تھے سنانیں چمکتی تھیں   ترکش کھلے ہوئے تھے کمانیں کڑکتی تھیں
پیکانیں تھیں کہ پھول تھے وہ بے کھلے ہوئے
گوشوں سے تھے کمانوں کے گوشے ملے ہوئے

میدان جنگ کا سماں اس بند میں دکھایا ہے۔ برچھیوں کا لچکنا، اُن کی اَنی کا تیز ہو اور چمکنا، نیزہ بازوں کا اپنے نیزے تولنا، ترکشوں کا کھلا ہونا اور کمانوں کا کڑکنا پیکانوں کا پھول کی کلیوں کی طرح دکھائی دینا اور کمانوں کے چلّوں کا کانوں تک کھنچا ہوا دکھائی دینا، یہ سب میدان جنگ کے آلات حرب و ضرب اور واردات و واقعات ہیں۔ دوسرے شعر میں اور نیز ٹیپ میں صنائع لفظی بھی دلکش ہیں پھر اسی شعر میں دُہرے دُہرے قافیے اور الفاظ دونوں مصرعوں کے ہموزن ہیں نیزے، ترکش، تُلے ہوئے تھے، کھلے ہوئے تھے۔ سنانیں، کمانیں، چمکتی کڑکتی۔ یہ الفاظ دونوں مصرعوں کے صنعت ترصیع ظاہر کر رہے ہیں اور ٹیپ میں پیکاں کی تشبیہ غنچے کے ساتھ پُر لطف ہے۔

صاحبو! مرقع نگاری اور مرصع نگاری کا موضوع ختم کرنے سے پہلے ایک بات آپ کی دلچسپی کے لیے اور عرض کرتا ہوں۔ جن لوگوں نے انگریزی تعلیم پائی ہے وہ ایشیائی نظم پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اُس میں خویشتن داری اور سیلف ہیلپ

اور آزادی کے مضامین نہیں ہیں - وہ واقف نہیں ہیں کہ فقط گلستاں اور بوستاں میں خودداری اور آزادہ روی کے کتنے مضامین بھرے پڑے ہیں - اسی طرح اور شعراء کے یہاں بھی بے شمار مضامین ہیں - مثلاً ؎

بدست آہک تفتہ کردن خمیر ○ بہ از دست بر سینہ پیش امیر

گر راست سخن باشی و در بند بمانی ○ بہ زانکہ دروغت دہد از بند رہائی

دو نان از دست دو نانِ جہاں باشد سناں خوردن

سناں در سینہ خوردن بہ کہ از دو ناں دو ناں خوردن

شہے کہ پاس رعیت نگاہ میدارد ○ حلال باد خراجش کہ مزد چوپانی ست

دگرنہ راعی خلق ست زہر مارش باد ○ کہ ہرچہ می خورد از جزیۂ مسلمانی ست

اسی طرح ہزاروں موقعوں پر شریفانہ اور آزادانہ مضامین کی بھرمار ہے لیکن میں صرف دو شعر نظامی کے سناؤں گا اور انگریزی خواں بھائیوں کو مخاطب کر کے عرض کروں گا کہ مختصر مضمون خویشتن داری اور سیلف ہیلپ کا اس سے بہتر سنائیں جو کسی انگریزی کتاب میں اُنھوں نے پڑھا ہو ؎

بہ ہمانی خویش تا روز مرگ ○ درختے شو از خویشتن ساز برگ

معنی یہ ہیں کہ ہر شخص کو چاہیے کہ اپنی روزی خود محنت کے ساتھ حاصل کرنے میں درخت بن جائے اور معاش حاصل کرنے میں کسی کا احسانمند اور محتاج نہ بنے۔ جیسے درخت اپنی ہی قوت و ہمت سے پرورش پاتا ہے - کسی آدمی کی مدد کا محتاج نہیں رہتا ہے - یہی طریق انسان کو اختیار کرنا چاہیے - درخت جب تک

بچہ ہے آدمی کی مدد کا طالب ہے لیکن جس وقت سے کہ وہ نوجوان ہوتا ہے وہ کسی کا محتاج نہیں رہتا۔ بچپن میں وہ ہمارا محتاج ہے کہ ہم اُس کو پانی دیں۔ مٹی بھی اُس کے لیے اچھی اور کافی ہونی چاہیے۔ دھوپ کی بھی اُس کو ضرورت ہے۔ ہَوا بھی کافی اُس کو لگنا چاہیے۔ یعنی یہ کہ اُس کے گرداگرد جھاڑیاں اور درخت نہ ہوں کہ دھوپ اور ہَوا کو روکیں۔ لیکن نوجوان ہونے کے بعد وہ خود سب سامان اپنی جسمانی اور خوراک کا کرلیتا ہے۔ پانی زمین سے جذب کرتا ہے۔ اُس کی جڑیں زمین کی مٹی کو پکڑ لیتی ہیں۔ ہَوا اور دھوپ وہ خود لیتا اور جذب کرتا ہے۔ اس کے سوا اُس کی ہمّت اور استقلال کو بھی دیکھنا چاہیے۔ جیٹھ بیساکھ کی دھوپ اور ساون بھادوں کا مینھ اور ماگھ پوس کی سردی اور برف اور اولے اور طوفان ہوا اور زمین کے زلزلے اور بادل کی گرج اور بجلی کی آگ سب برداشت کرتا ہے اور جب اُس میں میوہ لگتا ہے تب وہ ہمارے پتھر اور بانس کھاتا ہے۔ لوگ اُس سے پھل پھول، چھال، لکڑی، پتّے لیتے ہیں۔ دوست اور دشمن دونوں کی خاطر تواضع کرتا ہے اور بے انتہا فائدہ پہونچاتا ہے اور جب وہ مرجاتا ہے (یعنی سوکھ جاتا ہے) تب بھی جلانے کی لکڑی اور عمارت کی لکڑی ہم کو دیتا ہے اور زندگی اور مَوت دونوں حالتوں میں فائدہ پہونچانے اور فیاضی کرنے میں عذر نہیں کرتا، بس ایک درخت سے زیادہ خویشتن داری، سیلف ہیلپ، سیلف ریسپکٹ اور "اپنی مدد آپ کرو" کا احساس اور کس میں پایا جاسکتا ہے اور نہ ایسی ہمت، استقلال، تواضع، فیاضی اور رفاہ عام کسی میں ہوسکتا ہے۔

اب میں آپ کی خدمت میں توارد، سرقہ، ترجمہ، استنباط کے موضوع پر

کچھ بیان کروں گا ۔ آج کل نوآموز شاعر اکثر اعتراض کر بیٹھتے ہیں کہ فلاں شاعر کا مضمون چُرا لیا ۔ اُن کو معلوم ہونا چاہیے کہ توارد تو کسی صورت میں بھی قابلِ الزام نہیں ہے ۔ علمائے معانی نے توارد کی مثال یہ دی ہے کہ دو راہرو ہیں ۔ ایک آگے نکل گیا ہے اور جس طرف جس سڑک پر وہ چل رہا تھا، اُسی طرف اُسی سڑک پر دوسرا راہرو بھی چل رہا ہے ۔ لیکن اس کو کچھ خبر نہیں ہے کہ میرے آگے ایک مسافر چلا گیا ہے ۔ ایسی صورت میں اگر پہلے مسافر کے نقشِ قدم پر دوسرے مسافر کا قدم پڑ جائے تو کیا مضائقہ ہے اور کیا الزام اس پر آسکتا ہے ۔ اسی طرح اغراض و مقاصد و مطالب متحدہ کے بیان میں توارد ہو سکتا ہے ۔ مثلاً فردوسی نے یوسف زلیخا لکھی ۔ اُس کے بعد جامی نے بھی کئی سو برس بعد یوسف زلیخا لکھی ۔ تمام روایات و حکایات جو فردوسی نے بیان کیں وہی جامی نے کیں تو کوئی شخص جامی کو سارق اور اُس کی یوسف زلیخا کو مسروقہ نہیں کہہ سکتا ۔

توارد و سرقہ کے سوا ایک شکل ترجمے کی ہے ۔ یعنی شاعر نے دیکھا کہ کسی زبانِ غیر میں کسی شاعر نے نہایت عمدہ مضمون پیدا کیا ہے ۔ اُس کو اُس نے اپنی زبان میں ترجمہ کر کے لے لیا ۔ چاہے وہ اُس میں زیادہ خوبی پیدا نہ کر سکا ۔ یہ جائز ہے ۔ کیونکہ اس میں زبان کی ترقی مقصود ہے ۔ شاعر کے واسطے یہ خوبی کی بات ہے کہ وہ اپنی زبان کو ترقی دے اور عمدہ عمدہ مضامین لا کر اُس میں داخل کرے ۔ جیسے ناصر علی کا شعر ہے ؎

برقع برخ افگندہ برو ناز بہ باغش
تا نکہت گل بیختہ آید بہ دماغش

اس کا ترجمہ میر افضل حسین صاحب ثابت لکھنوی نے زبان اُردو میں بہت خوبی کے ساتھ کیا ہے اور مطلع کا مطلع رکھا ہے ؎

نقاب ڈال کے رُخ پر وہ باغ میں آئے
کہ چھن کے نکہت گل بھی دماغ میں آئے

گو یہ ترجمہ بہت اچھا ہے لیکن ناز کا لفظ ترجمہ میں نہیں آیا جو شعر کی جان ہے۔ اگر فارسی شعر سے ناز کا لفظ نکال ڈالا جائے، تو پھر کچھ خوبی نہیں رہتی۔ تاہم ترجمہ قابل تعریف ہے۔

ان کے سوا چوتھی شکل اور ہے۔ جس کو کتابوں میں توسرقۂ مستحسن لکھا ہے۔ لیکن عالموں اور شاعروں نے زمانۂ حال میں اُس کو استنباط کہا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ایک شاعر پہلے شاعر کے مضمون کو پورا یا تھوڑا دانستہ لے لے۔ لیکن اُس مضمون کو بلند کردے۔ یعنی اُس میں ترقی یا اضافہ کرے۔ جیسے فردوسی کا شعر ؎

یکے خیمۂ داشت افراسیاب　　　زمشرق بہ مغرب کشیدہ طناب

جب نظامی کی باری آئی تو اُس نے دیکھا کہ مضمون تو بہت اچھا ہے مگر شاعر ثبوت نہ دے سکا۔ اُس نے ایک لفظ تبدیل کر کے ثبوت دیا اور یوں کہا ؎

یکے خیمۂ داشت چوں آفتاب　　　زمشرق بہ مغرب کشیدہ طناب

جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زمین شعر آسمان تک بلند ہوگئی۔ سعدی کہتا ہے ؎

ترا ہر آئنہ باید بہ شہر دیگر رفت　　　کہ دل نماند دریں شہر تا ستانی باز

خسرو دہلوی نے دیکھا کہ مبالغہ تو بہت اچھا کیا تھا مگر طریق ادا بہت بھدا اور بھونڈا ہے۔ عاشق کا محبوب سے یہ کہنا کہ تم یہ شہر چھوڑ کر دوسرے شہر کو چلے جاؤ

کس قدر نا زیبا ہے۔ لہذا اُس نے ترقی دے کر شعر کو چمکا دیا ؎

کسے نہ ماند کہ دیگر بہ تیغ ناز کُشی
مگر کہ زندہ کنی خلق را و باز کُشی

استنباط کی مثال یوں سمجھیے کہ اگر ایک چراغ سے سَو چراغ روشن کر لیے جائیں تو کیا مضائقہ۔ تیل اپنا، بتی اپنی، چراغ اپنا۔ کسی کے یہاں چراغ جل رہا ہے۔ اُس کی لَو سے چراغ روشن کر لیا تو یہ کیا چوری ہے؟ اگر یہ چوری ہے تو ٹمٹم اور فٹن اور بائیسکل، ریل گاڑی، موٹر وغیرہ سب چوری میں داخل ہیں۔ کیونکہ چھکڑا اور اس کے پہیے تو موجود تھے، اُسی کی نقل تو ہے۔

صاحبان والاشان میں آپ کے شکریے اور خیر مقدم کے لیے کھڑا ہوا تھا۔ خیالات کی رو میں کہاں سے کہاں پہونچ گیا۔ ع

کجا بودم اشہب کجا تاختم

لیکن خیال کرتا ہوں کہ آپ کی ضیافت طبع کا سامان بذریعہ اس تقریر کے کچھ ہوا ہو تو عجب نہیں۔

گوکھلے کا غم

مارچ ۱۹۱۵ء کے شروع میں بمقام سرستی بھون ایک جلسہ ماتمی، مسٹر گوکھلے کے انتقال پُر ملال پر رنج و افسوس ظاہر کرنے کی غرض سے منعقد کیا گیا۔ مسٹر ان صاحب نے اس جلسے میں حسب ذیل ماتمی تقریر کی:۔

میر مجلس اور حضرات انجمن!

خزاں رسید و گلستاں بآں جمال نماند — نوائے بلبل شوریدہ رفت و حال نماند
نشان لالہ ایں باغ از کہ می پرسی — برو کہ انچہ تو دیدی بجز خیال نماند

آج ہم سب لوگ ہندو مسلمان، ہر جماعت و گروہ کے اشخاص اس غرض سے جمع ہوئے ہیں کہ اپنے نہایت عزیز ہموطن اور ملک و قوم کے پیشوا مسٹر گوکھلے کی بے وقت وفات حسرت آیات پر اشک ماتم بہائیں، جن کے مرنے کا نہ صرف ہندوستان کے باشندوں کو افسوس ہے، بلکہ برطانیہ نے بھی اپنا مشیر اور خیر اندیش سمجھ کر رنج و غم ظاہر کیا ہے۔ مرحوم کے مرنے سے ہمارا ایک پولیٹیکل رشی اُٹھ گیا اور گورنمنٹ برطانیہ اور گورنمنٹ ہند کا ایک خیر خواہ رکن سلطنت ہمیشہ کے لیے جاتا رہا۔ اس عظیم الشان اور

ہر دلعزیز حبیب وطن کے کارنامے بیان کرنے کے لیے ایک طولانی تقریر کی ضرورت ہے۔ جو اس ماتمی جلسے میں زیادہ موزوں نہیں ہو سکتی، لیکن چونکہ یہ ایک رسم ہے کہ جس کا نوحہ یا مرثیہ پڑھا جائے اُس کی خوبیاں کچھ نہ کچھ بیان کی جائیں، اس لیے مختصر طور پر اس بے نظیر محب وطن کے عدیم المثال کارنامے معرض بیان میں لاتا ہوں۔

ہمارے دوست مرحوم جب فرگسن کالج میں پڑھتے تھے، اُس وقت سے اُن کے پروفیسروں کو اُن کی اعلیٰ درجے کی قابلیت کا احساس ہونے لگا تھا اور پیشین گوئی کی جاتی تھی کہ یہ شخص بڑا ہونہار ہوگا۔ پڑھ کر فارغ ہوئے، تو فرگسن کالج ہی میں پروفیسر کی حیثیت سے ۲۰ سال تک درس و تدریس کی خدمتیں انجام دیں۔ گزارے کے لیے کالج سے صرف پچھتر روپیہ ماہوار لیتے تھے۔ یہ ایثار کالج میں اب تک یادگار ہے اور آیندہ بھی یادگار رہے گا۔ ۱۸۸۹ء میں جبکہ وہ ۲۲ برس کے سن میں بمبئی پراونشل کانفرنس میں شریک ہوئے تو مسٹر ڈھولکر نے پیشین گوئی کی کہ یہ شخص کسی دن کانگریس کا صدر ہوگا۔ یہ پیشین گوئی پوری ہوئی اور آپ کانگریس کے صدر ہو کر بے تاج کے بادشاہ کہلائے۔

مسٹر گوکھلے عالم، فاضل، سوشل رفارمر یعنی مصلح اخلاق اور مصلح قوم و ملک تھے اور خاصکر ابتدائی تعلیم کے بہت بڑے حامی تھے پست اقوام کے بہت بڑے مربی اور سرپرست تھے، جن کو اونچی قوم کے ہندو چھونا بھی پسند نہیں کرتے۔ اچھوت ذاتوں کو وہ اونچی سطح پر لاکر اپنے برابر

کرسی پر بٹھانا چاہتے تھے ۔ اُن غریبوں اور بیکسوں کی خاطر صرف محنت و کوشش ہی نہیں کرتے تھے بلکہ اُن کی قسمت کے ساتھ مرحوم نے اپنی تقدیر کو وابستہ کر دیا تھا اور اُن کی تکلیفوں اور مصیبتوں میں شریک ہو کر اُن کا ساتھ دیتے تھے ۔

ہمارے دوست مرحوم "سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی" ایسی قائم کر گئے ہیں، جو اُن کا نام نامی آیندہ نسلوں میں احسانمندی کے ساتھ ہمیشہ زندہ رکھے گی ۔ اس کے ممبر بھی اپنے مرشد اور گرو کی طرح زر و مال کو کچھ مال نہیں سمجھتے اور ہمارے ملک و قوم کی خدمت انواع و اقسام طریق پر کر رہے ہیں ۔ عورتوں کو پڑھانا لکھانا، بیواؤں کی تکلیفیں کم کرنا اور اُن کی حالت درست کرنا، اچھوت ذاتوں کو اونچی سطح پر لانا، صفائی اور حفظانِ صحت کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا خیال عام لوگوں میں پھیلانا، کواپریٹیو سوسائٹی کے ذریعے غریبوں اور بیکسوں کو سود کھانے والوں کے پنجۂ ظلم سے نجات دینا، یہ سب اعلیٰ درجے کی بیش بہا خدمات ہیں، جن سے ہمارا ملک مستفید ہو رہا ہے اور یہ سب کچھ فوائد اُس مرحوم کی بدولت ہیں ۔

مسٹر گوکھلے نے سات مرتبہ ولایت کا سفر ہم لوگوں کی خاطر کیا ۔ پہلا سفر ۱۸۹۷ء میں اس غرض سے کیا تھا کہ رایل کمیشن کے روبرو ہندوستان کے ملکی مصارف کے متعلق شہادت دیں ۔ وہاں جا کر ہمارے دوست نے اس موضوع پر اس کے جزئیات و کلیات کی نسبت ایسی

واقفیت ظاہر کی کہ لوگ عش عش کر گئے - دوسرا سفر ۱۹۰۵ء میں ہوا۔
جس میں ہندوستان کے متعلق اُنچاس[۴۹] دان میں اُنھوں نے ۴۵ اسپیچیں
دیں - تیسرا سفر بنارس کانگریس کے ڈیلیگیٹ کی حیثیت سے ۱۹۰۶ء
میں ہوا - چوتھا ۱۹۰۸ء میں اور پھر ۱۲-۱۳-۱۴ء میں تین سفر ہوے - ان
سب سفروں میں مرحوم نے جو ملکی خدمات انجام دیں اُن کو چھوڑ کر صرف
۱۹۰۸ء کے ایک سفر کو لے لیجیے، کیونکہ اس سفر میں انھوں نے جو
کام کیا صرف وہی ایسا ہے جو اُن کی بزرگی و عظمت ملک و قوم کے
نزدیک قائم کرنے کے لیے اور یادگار ہونے کے لیے کافی ہے - وہ
کام یہ ہے کہ آپ نے لارڈ مورلے سے کئی مرتبہ گفتگو کر کے ویسرائے
کی کونسل میں توسیع اور اصلاح کرادی جس کی بدولت چھ سات برس سے
ہم لوگ کثرت سے کونسلوں میں شریک ہونے کی غرض سے منتخب ہوا کرتے
ہیں - اسی طرح ابھی حال میں جنوبی افریقہ جا کر وہاں کے وزیروں سے
(مثل بوتھا اور اِسمٹس وغیرہ کے) مل کر ہندوستانیوں کی تکلیفیں دور کیں اور
جو مخالفت کی آگ بھڑک رہی تھی اُس پر پانی ڈال دیا -

مسٹر گوکھلے وہ شخص تھے، جو قوم کے فدائی تھے اور زندگی فقط
ملک و قوم کے واسطے بسر کرتے تھے - طبیعت میں وہ انکسار تھا کہ
سال گزشتہ جب گورنمنٹ نے کے، سی، آئی، ای، کا خطاب دیا، تو
قبول کرنے سے انکار کر دیا - ہمارا کام کرنے میں اس قدر محو تھے کہ اپنے
کام اور اپنی ذات کی پرواہ اُن کو مطلق نہ تھی - وہ صرف ہمارے

کام میں ہمہ تن مصروف و مشغول رہا کرتے تھے - گویا ان کا عمل اس مقولے پر تھا سے

وہ محو ہیں کہ ذرا غم نہیں ملال نہیں   ترا خیال ہے اپنا ہمیں خیال نہیں

انگریزی جملہ جو کہا جاتا ہے He died in harness وہ ہمارے دوست پر صادق آتا تھا کہ ہمارا کام کرتے کرتے جان دے دی - مرحوم نے زر و دولت کو خاک کی برابر سمجھا اور مثل رومن سینیٹرس (Senators) کے ہمیشہ سچائی اور ایمانداری کے ساتھ افلاس کی زندگی بسر کی - وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے سوشل رفارم (یعنی معاشرتی و تمدنی اصلاح) کو بھی ویسا ہی ضروری سمجھا جیسا کہ اصلاح ملکی کو - اُن کا قول تھا۔ "Institutions are made by men and not men by institutions."

حضور ویسرائے نے اپنی کونسل میں فرمایا کہ "مسٹر گوکھلے نے صیغۂ مال، صیغۂ تعلیم اور امور انتظامی پر بحث کرنے میں نہایت قابلیت ظاہر کی اور جنوبی افریقہ کے پیچیدہ مسئلے کو، جو ہندوستانیوں سے متعلق تھا، نہایت مدبری اور خوبی سے سُلجھایا، جو بظاہر عقدۂ لاینحل تھا" اور یہ بھی فرمایا کہ "وہ نہ صرف کونسل کے بیش بہا ممبر تھے بلکہ ہمارے دوست بھی تھے" یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ مسٹر گوکھلے کو جو واقفیت مال کے صیغے سے تھی وہ بیس برس ادھر سے کسی سکریٹری محکمۂ مال یا کسی ممبر صیغۂ مال کو حاصل نہیں ہوئی - ہمارے لفٹننٹ گورنر بہادر سر جیمس مسٹن جو پہلے فنانشل سکریٹری گورنمنٹ ہند تھے، وہ مسٹر گوکھلے کو مسٹر گلیڈسٹن سے تشبیہ دیتے تھے -

مسٹر گوکھلے کو گورنمنٹ اور حکام اس وجہ سے زیادہ پسند کرتے تھے کہ اُن میں خود غرضی، سخن پروری اور ہٹ دھرمی نہ تھی۔ بخلاف اس کے انکسار، سچائی اور معقول پسندی تھی۔ دنیا کے معاملات میں دو باتوں کی بڑی ضرورت ہے۔ ایک یہ کہ خوش تدبیری اور ایمانداری سے لوگوں کے دلوں کو اپنی طرف مائل کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ سخن پروری اور ضد نہ کی جائے، بلکہ ہمیشہ سمجھوتا کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔

آسائش دو گیتی تفسیر ایں دو حرف ست با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا

عملی سیاست میں ہر موقع پر برابری اور آزادی کا دعویٰ کرنا اور حقوق انسانی پر لڑنا ٹھیک نہیں ہے، بعض وقت اس اصول پر عمل کرنا پڑتا ہے۔

نہ ہر جائے مرکب تواں تاختن کہ جاہا سپر باید انداختن

یہ سب باتیں مسٹر گوکھلے میں نمایاں طور پر تھیں، جن کے باعث اُن کو سوشل اور پولیٹیکل معاملات میں کامیابی ہوا کرتی تھی۔ ایسے نازک وقت میں جیسا کہ اب ہے، عامۂ رعایا اور نیز گورنمنٹ کو ایسے شخص کی بڑی ضرورت ہے کہ جس میں مثل مسٹر گوکھلے کے، خوبیاں اور لیاقتیں ہوں، اس لیے اُن کی وفات سے جو نقصان پہونچا وہ ایسا قومی اور ملکی نقصان ہے جو ملک اور قوم کی بدقسمتی پر دلیل قاطع ہے۔ اصل میں مسٹر گوکھلے کے طور وطریق، اُن کی عقلمندی، فرزانگی، خوش تدبیری، سچائی اور ایمانداری اس بات کی روشن مثال ہے کہ مفتوحہ ملک و قوم کا ایک لائق فرزند اپنی قوم و ملک کو پستی مذلت سے اُبھار کر کس طرح بلند سطح پر لا سکتا ہے اور رعایا اور گورنمنٹ

دونوں کا معتمد علیہ بن سکتا ہے۔

جب مسٹر گوکھلے کا جنازہ اُٹھا، تو بیس ہزار آدمی ماتم کرنے والے اُس کے ساتھ تھے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں نے یکساں ماتم کیا اور وائسرائے گورنر بمبئی اور حضرت جارج پنجم اور آغا خان کے تار ہمدردی اور رنج و غم کے اظہار میں آئے۔ سرکاری اور غیر سرکاری دفتر سب بند ہوگئے۔ الہ آباد میں، جہاں اُن کے پھول جمنا گنگا کے سنگم میں ڈالے گئے، عام طور سے تعطیل ہوگئی۔ پھولوں کے ساتھ جو جلوس تھا، اُس میں بڑے بڑے عمائدین کے دوش بدوش گورنمنٹ کی طرف سے کلکٹر ضلع نے بھی شرکت کی اور الہ آباد میں جو جلسہ ماتمی ہوا اُس میں حکام ہائی کورٹ، کمشنر اور کلکٹر اور تمام نامی گرامی ہندو مسلمان شریک ہوئے۔

لارڈ ہارڈنگ ہی نے اُن کی لیاقتوں اور خوبیوں کی داد نہیں دی بلکہ اُن کی زندگی میں ۱۹۰۸ء میں لارڈ منٹو نے بھی، جب اُن کی تقریر بجٹ پر سنی، تو فرمایا کہ "یہ سب سے اچھی اور ایسی تقریر ہے کہ انگلستان میں بھی بہت کم لوگ ایسی تقریر کر سکتے ہیں"۔ اسی طرح سر ایڈورڈ بیکر نے فرمایا کہ "میری خواہش سب سے بڑی یہ ہے کہ میرے بعد فنانشل ممبر اس کونسل کے مسٹر گوکھلے مقرر ہوں"۔

مسٹر گوکھلے نے ہمیشہ اپنے آپ کو ماتحت کارکن یعنی ایک چھوٹا کام کرنے والا اور اپنے مقابلے میں رانا ڈے، سر فیروز شاہ مہتا اور دادا بھائی نوروجی وغیرہ کو ترجیح دی۔ دنیا میں یہ دیکھا گیا ہے کہ جو کوئی بڑوں کو مقدم سمجھتا ہے اور اپنے آپ کو اُن کا چھوٹا اور پیرو خیال کرتا ہے، وہ آخر میں خود بڑا مانا جاتا ہے اور جو دوسروں کا نام قائم رکھنے کی کوشش کرتا ہے، اُس کا نام خود بھی دنیا میں

قائم اور برقرار رہا کرتا ہے۔ چنانچہ اسی فلسفیانہ جذبے کے باعث آج مسٹر گوکھلے کے نام کا قلمرو ہند میں ڈنکا بج رہا ہے۔

مسٹر گوکھلے کی تعریف سب سے بڑھ کر یہ ہے کہ انھوں نے پولیٹیکل معاملات میں اعتدال کا خیال زیادہ رکھا۔ مسٹر تلک نے مسٹر گوکھلے کی وفات کے وقت تک یہ اعتراض کیا کہ وہ Moderates اور Extremists میں اتحاد پیدا نہ کرا سکے اور دونوں کی شرکت سے متحدہ کانگریس وجود میں نہ لا سکے، لیکن جب جنازہ گھاٹ پر پہونچا، تو مرحوم کے مخالف مسٹر تلک نے خود Funeral oration دیا اور ہزاروں آدمیوں کو جو وہاں موجود تھے ہدایت کی کہ مرحوم کے طور وطریق اختیار کرو اور اُن پر پورا عمل کرو۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ خود مسٹر تلک نے بھی مرحوم کا ڈھنگ اختیار کرنے پر آمادگی ظاہر کی۔

صاحبان والاشان! الہ آباد جیسے متبرک مقام میں، جہاں گنگا جمنا کا سنگم ہے، جہاں اس شہید ملکی کے پھول ڈالے گئے ہیں، ایک یادگار بنانی چاہیے تاکہ لاکھوں جاتری، جو وہاں جاتے ہیں، اس فدائے قوم و ملک کی یادگار کے درشن کیا کریں اور اپنی آنکھوں سے آنسوؤں کے موتی اُس کی یاد میں نچھاور کیا کریں۔ ہم سب کو مسٹر گوکھلے کے کارہائے نمایاں سے یہ سبق ملتا ہے کہ خود غرضی چھوڑ کر ملک کے بھائیوں کی خدمت سچائی اور ایمانداری سے کریں اور جو کچھ مرنے والا کر گیا ہے اُس کو سعی و کوشش سے بحال و برقرار رکھیں، تاکہ ہمارے کام بھی آیندہ نسلوں کے لیے دنیا میں یادگار رہ جائیں ؎

عمل کن کہ فردا نماند و لیک   جزائے عمل ماند و نام نیک

پنڈت بشن نراین در کا ماتم

پنڈت بشن نراین در بیرسٹر کی وفات حسرت آیات کے غم میں ایک
جلسۂ عام بمقام سرستی بھون فرخ آباد اس غرض سے کیا گیا کہ مرحوم کے انتقال
پُرملال پر رنج و افسوس ظاہر کیا جائے اور اُن کے کارنامے اور اخلاق حمیدہ
اور اوصاف پسندیدہ منظر عام پر لائے جائیں۔ مُشران صاحب نے جو تقریر
اس موقع پر کی وہ درج ذیل ہے:۔

کہاں ہیں وہ اہرام مصری کے بانی — کہاں ہیں وہ گُردان زابل ستانی
گئے پیشدادی کہاں اور کیانی — مٹا کر رہی سب کو دنیائے فانی
لگاؤ کوئی کھوج کلدانیوں کے
بتاؤ نشاں کوئی ساسانیوں کے

میر مجلس اور حضرات انجمن!

آج ہم سب لوگ ہندو مسلمان عیسائی ہر گروہ اور جماعت کے اشخاص،
اس ماتمکدے میں اس غرض سے جمع ہوئے ہیں کہ پیشوائے قوم اور فدائے ملک،
پنڈت بشن نراین در کے انتقال، پُرملال پر اشک ماتم بہائیں اور اُن کا نوحہ
اور مرثیہ پڑھیں۔

صاحبو! ہمارے پنڈت صاحب نے ابتدائی تعلیم لکھنؤ کی مشہور تعلیم گاہ
کیننگ کالج میں پائی۔ لیکن بی، اے کی ڈگری حاصل نہ کرنے پائے تھے

کہ ولایت جانے کا شوق دامنگیر ہوا۔ لڑکپن ہی سے ذہانت کے آثار بُشرے سے نمایاں تھے اور نہایت درجہ ہونہاری ٹپکتی تھی۔ تحصیل علم کی طرف رجحان خداداد تھا اور ذہن سلیم اور طبع مستقیم قدرت کی طرف سے ودیعت ہوئے تھے۔ آپ کشمیری پنڈتوں میں پہلے شخص تھے جنھوں نے ولایت جاکر مذہبی قیود کی زنجیریں توڑ دیں۔ کشمیری کلب لکھنؤ کے سکریٹری تھے۔ مگر اُسی وقت مردم شناس اشخاص کہا کرتے تھے کہ یہ لڑکا آسمان شہرت پر آفتاب کی طرح چمکے گا۔ چنانچہ ولایت جاکر بیرسٹری کا امتحان پاس کیا اور وہاں کے اعلیٰ درجے کے عالم اور فلسفی پروفیسر میکس میولر اور پروفیسر ہکسلی وغیرہ کی صحبت باسعادت سے ستفید ہوکر اپنے دل و دماغ کو روشن کیا اور اپنے بھائیوں کے واسطے چراغ ہدایت بن گئے۔ اُن کی واپسی پر ہندوستان میں اُن کی قوم میں جھگڑا ہوا اور دو فریق بن گئے۔ ایک فریق اُن کا طرفدار تھا جو بشن سبھا کے نام سے موسوم ہوا اور دوسرا فریق مخالف دھرم سبھا کہلایا۔

ولایت سے واپس آکر آپ نے ملک و قوم کی خدمت پر کمر ہمت چست باندھی۔ اُسی سال مدراس کانگریس میں شریک ہوئے اور ایسی اسپیچ دی جو اعلیٰ درجے کی تقریروں میں شمار کی جاتی ہے۔ ہیوم صاحب نے اس اسپیچ کی داد دی۔ پنڈت جی مرحوم انڈین نیشنل کانگریس کے بڑے حامی و مددگار تھے اور کانگریس پلیٹ فارم پر اُن کی تقریریں خوش بیانی اور فصیح الکلامی کا اعلیٰ نمونہ ہوتی تھیں۔ اخبار ایڈوکیٹ لکھنؤ کے سب سے پہلے ایڈیٹر تھے اور پھر اُس کے مشہور نامہ نگار رہے۔ اخبار لیڈر الہ آباد میں بہت قابل قدر

مضامین درج کیا کرتے تھے ۔ اُن کی تصنیف سے ایک پمفلٹ ہے جس کا نام "سائنز آف دی ٹائمس" ہے جو نہایت قابل قدر ہے ۔

پنڈت صاحب لکھنؤ میونسپل بورڈ کے ممبر عرصے تک رہے اور ویسرائے کی کونسل میں بھی شریک ہوئے ۔ ایک دفعہ پراونشل کانگریس کے پریسیڈنٹ اور ایک دفعہ کانگریس کے میر مجلس منتخب کیے گئے ۔ ظاہر ہے وہ درجہ ، جو کانگریس کے پریسیڈنٹ کا ہندوستان میں سمجھا جاتا ہے ۔ لکھنؤ میں جب کانگریس ہونے والی تھی تو اُس کی استقبالی کمیٹی کے چیرمین مقرر ہوئے مگر اشتداد علالت کے باعث استعفار دے دیا ۔

پنڈت صاحب اُردو اور فارسی کے فن انشاء کے ماہر تھے اور انگریزی زبان کے بھی بڑے ادیب تھے اور اُس پر خوب عبور رکھتے تھے ۔ اُن کے انگریزی مضامین نہ صرف ہندوستان میں بلکہ انگلستان میں بہت قابل قدر سمجھے جاتے تھے ۔ کہا جاتا ہے کہ زبان غیر پر عبور ہونا مشکل ہے ۔ مَیں کہتا ہوں کہ اپنی مادری زبان پر قدرت حاصل کرنا کیا آسان کام ہے ؟ وہ اُردو کے بڑے خوش فکر شاعر تھے اور اُن کی شاعری نئے خیالات سے بھری ہوئی تھی اور نہایت قدر و منزلت کے لائق سمجھی جاتی تھی ۔

پنڈت صاحب نے چودہ [۱۴] برس سِل کے عارضے سے سخت تکلیف پائی لیکن باوجود اس تکلیف کے کبھی ملک و قوم کا کام کرنے سے غافل نہیں ہوئے ۔ بلکہ ہمیشہ زندہ دلی اور مستعدی سے ہمارے کام میں محو رہے اور اپنی تکلیف کا خیال کبھی نہیں کیا اور یہی سمجھا کیے کہ میں دوسروں کے واسطے

زندگی بسر کرنے کے لیے پیدا ہوا ہوں - ہنستے ہی ہنستے خندہ پیشانی کے ساتھ جان دے دی اور سب کو روتا چھوڑ گئے - گویا اُن کا قول یہ تھا کہ ؎

یاد داری کہ وقت زادن تو ہمہ خندہ بُدند و تو گریاں

توچناں زی کہ بعد مردن تو ہمہ گریاں شوند و تو خنداں

انگریزی میں جو کہا جاتا ہے کہ He died in harness یہ جملہ ان پر صادق ہے - واقعی اُنھوں نے کام کرتے ہی کرتے جان دے دی - ہمیشہ اُن کے مزاج میں قناعت رہی - قابل عزت افلاس میں بسر اوقات کی، لیکن مرتے وقت نیک کاموں کی دولت کثیر اپنے ساتھ لے گئے جس پر بڑے بڑے مالداروں کو رشک ہونا چاہیے - اُن کی آزاد خیالی، راستبازی، مستقل مزاجی اور کسر نفسی کے متعلق ڈاکٹر تیج بہادر سپرو نے بہت ٹھیک لکھا ہے - وہ فرماتے ہیں -

"He was a man of courage and courage was based on the solid foundation of selflessness—firm as steel and pure as gold"

صاحبو! اُن کی زندگی اس بات کا نمونہ تھی کہ کیونکر انسان جسمانی تکلیفوں کو ہمت کے ساتھ برداشت کر سکتا ہے اور زندہ دلی کے ساتھ اپنے ہمجنسوں کا کام بخوبی تمام انجام دے سکتا ہے اور کیونکر تکلیف اور افلاس کی حالت میں بھی قناعت اور دیانت اور آزاد خیالی پر مستقل مزاجی سے قائم رہ سکتا ہے اور صرف باتوں سے نہیں بلکہ عمل کے ذریعے جوانوں اور بوڑھوں کا پیشوا بن سکتا ہے - ہم کو پنڈت صاحب مرحوم کی زندگی سے سبق سیکھنا

چاہیے کیونکہ فقط عمل یعنی نیک کام ہی ہمارے ساتھ جائیں گے اور کچھ نہیں سے

عمل کن کہ فردا نماند ولیک
جزائے عمل ماند و نام نیک

صاحبو! ہمارا رنج و غم اور بھی بڑھ جاتا ہے جب ہم خیال کرتے ہیں کہ ہماری بدقسمتی بلکہ تمام ملک کی بدنصیبی سے ہمارے چند پیشوا اور حبیبِ وطن، مثل کرشنا سوامی آئیر، مسٹر گوکھلے، مسٹر گنگا پرشاد ورما، مسٹر سُبرامنیا آئر اور سر فیروز شاہ مہتا کے، اس تین برس کے عرصے میں یکے بعد دیگرے اُٹھ گئے اور اُن کے بعد ہمارے دوست مسٹر ڈر بھی ہم کو داغ مفارقت دے گئے۔ یہ سب ایسے اشخاص تھے کہ زمانہ ہاتھ ملتا رہے گا کہ افسوس میں نے ایسے بے نظیر آدمیوں کو ہمیشہ کے لیے اپنے ہاتھوں سے کھو دیا۔ اہل لکھنؤ ہم سے بھی زیادہ افسوس کر رہے ہیں کیونکہ وہاں سے تین پیشوایان قوم یعنی بابو گنگا پرشاد ورما، پنڈت بشن نراین در اور پنڈت اقبال نراین مسلدان رخصت ہو گئے۔

محفلِ مشاعرہ
میں
حاضرین کی ضیافت طبع

ماہ مئی ۱۹۰۲ء میں ایک مشاعرہ بمقام چھبرامئو (ضلع فرخ آباد) منشی محمد اسمٰعیل صاحب وکیل کے مکان پر منعقد ہوا۔ جس میں علاوہ فرخ آباد و فتح گڑھ وغیرہ کے بیرونجات کے بھی کچھ شعراء شریک تھے۔ مشران صاحب بھی حسب الطلب شریک بزم سخن تھے۔ بانی محفل کی فرمائش سے موصوف نے ارباب انجمن کا خیر مقدم کیا۔ سامعین نے یہ فرمائش کی کہ شکریے کی اسپیچ میں ارباب مشاعرہ کی ضیافت طبع کا سامان بھی ہو۔ چنانچہ موصوف نے حسب ذیل خطبہ بداہتہً ارشاد کیا جس کو سُن کر حاضرین جلسہ بہت محظوظ ہوئے۔

حضرات انجمن!

مجھے یہ خدمت تفویض ہوئی ہے کہ میں صاحب خانہ کی طرف سے آپ سب صاحبوں کا خیر مقدم کروں کہ آپ نے اپنی تشریف آوری سے اس بزم سخن کو طراوت تازہ اور رونق بے اندازہ بخشی ہے۔ کاش یہ کام کسی شاعر نغز گفتار کو تفویض کیا جاتا جو نظم میں آپ کا شکریہ ادا کرکے آپ کو محظوظ کرتا۔ بخلاف اس کے اس فرض کی انجام دہی ایک ایسے ہیچمداں بنبہ دہاں کے ذمہ

کی گئی ہے جو نظم کا مذاق سلیم اور وجدان صحیح نہیں رکھتا اور نثر میں اور وہ بھی ٹوٹی پھوٹی نثر میں اپنے خیالات ظاہر کرے گا۔ صاحبان ذیشان! نثر بمقابلہ نظم کے، ایک کم رتبہ اور کم وزن چیز سمجھی جاتی ہے۔ یہ میرے لیے اور بھی مشکل چیز ہے ؎

خوش ست نثر ولے شان نظم افزون ست ۔۔۔ اتا قہ دس مصحف کلام موزون ست

اس موسم گرما میں آپ لوگوں کا اس جگہ تشریف لانا اور اکثر صاحبوں کا دور دست مقامات سے قدم رنجہ فرمانا، مغتنمات سے ہے اور نہایت شکریے کے قابل ہے۔ آپ سب حضرات نکتہ سنج کے جمع ہونے سے اس بزم شاعرہ میں وہی رونق د آرائش ہو گئی ہے جو باغوں کی زیب و زینت اشتداد بہار میں ہو جاتی ہے۔

آپ تمام احباب کو اور ہر قوم اور ہر جماعت کے اصحاب کو یکجا جمع دیکھ کر میرا جی بے اختیار چاہتا ہے کہ یہ کہوں ؎

وہ آئے گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے ۔۔۔ کبھی ہم اُن کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

صاحبو! ہمارا قصبہ چھپرا مئو اس ضلع کے اور قصبات کے مقابلے میں فی الجملہ ایک مردم خیز خطّہ سمجھا جاتا ہے۔ یہاں متعدد شاعر اور عالم پیدا ہو چکے ہیں۔ ایک شاعر نے چھپرا مئو کی تعریف میں کہا ہے ؎

بصرہ بنا دمشق بنا لکھنؤ بنا ۔۔۔ کچھ خاک بچ رہی تھی کہ چھپرا مئو بنا

ایسے مقام میں شاعروں اور نکتہ سنجوں کا جمع ہونا علم و فضل کے حق میں بہت مفید ہو گا اور جو لوگ شعر و سخن کا ذوق رکھتے ہیں اُن کے سمند شوق پر تازیانے کا کام دے گا۔

حضرات! علم تاریخ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر قوم و ملک میں جب کہ اوّل اوّل تہذیب و شائستگی کی روشنی پھیلی تو نظم نے وہاں کے علم ادب پر اپنا تسلط جمایا - اُس وقت بہادروں کے معرکے اور دیوتاؤں کے کرشمے، نظم میں بیان کیے جاتے تھے - اِس وقت بھی جبکہ نثر اُردو نے ہزاروں بکار آمد کتابیں ہمارے اُردو علم ادب میں مُدوّن کر دی ہیں، نظم کا وہ تسلط کم نہیں ہوا ہے بلکہ زباندانوں کا ایک بہت بڑا طبقہ اب بھی ہے، جو نظم کو بہت پسند کرتا ہے اور نظم ہی میں اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے - حق یہ ہے کہ بعض باتیں جو لطف نظم میں دیتی ہیں، نثر میں ہرگز وہ مزہ نہیں آتا - مثلاً زور بیان، شوکت الفاظ، تنوع تمثیلات، برجستگی استعارات، شوخی کنایات وغیرہ — مگر اب وہ وقت آ گیا ہے کہ نظم اُردو میں نئے نئے مفید اور بکار آمد مضامین دخل پائیں - قوم کو خواب غفلت سے بیدار کرنے والے خیالات، اُس کو پستی زوال سے اُبھار کر اوج کمال پر پہونچانے والے جذبات، قوم کی غیرت اور حمیت کی رگ کو حرکت دینے والے مضامین اور نام و ننگ کے احساس کو برانگیختہ کرنے والے خیالات، اگر نظم اُردو میں داخل کیے جائیں اور اُس کے ساتھ آداب شاعری کا برتاؤ پورا پورا کیا جائے، تو عام طبائع کے نزدیک نہایت پسندیدہ ہو اور ملک و قوم کے فروغ کا باعث ہو - اگر یہ ترمیم نظم اُردو میں ہو جائے - (جو بالفعل ہو رہی ہے اور اُمید ہے کہ آئندہ اس سے بھی زیادہ ہو جائے گی) تو پھر اُردو نظم کا مقابلہ دنیا میں کوئی دوسری نظم نہ کر سکے گی - آج کل دو شاعر یعنی مولوی شبلی نعمانی اور مولوی الطاف حسین حالی ایسے ہی نئے خیالات کی روح نظم اُردو کے

قالب میں پھونک رہے ہیں اور ملک اور قوم کے شکریے کے سزاوار ہیں۔

بعض لوگوں نے جن کو نظم کا مذاق بالکل نہیں ہے یا بہت کم ہے اور جنھوں نے ایشیائی شاعری کا پورا لطف حاصل نہیں کیا ہے اور محض انگریزی خیالات کے قدردان ہیں، یہ خیال کر رکھا ہے بلکہ یک طرفہ فیصلہ کر رکھا ہے کہ ایشیائی نظم خواہ وہ اُردو ہو یا فارسی، نہایت ناقص ہے اور سوائے عشقیہ مضامین کے اُس میں اور کچھ نہیں ہے۔ اس خیال کی تردید اگر اس وقت بطور مختصر کی جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ اُن کو معلوم نہیں کہ ایشیائی نظم کا پہلا اصول زبان سکھانا ہے۔ آداب و اخلاق کے مضامین جن کی کمی ہرگز نہیں ہے، ایسے پیرایے میں بیان کیے جاتے ہیں کہ لوازمات شاعری کا پورا پورا برتاؤ ہو جائے۔ جس سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ آداب شاعری سکھائے جائیں اور اصناف سخن پر عبور ہو۔ ردیف و قافیہ کی قید ایسا قافیہ تنگ کرتی ہے کہ شاعر الفاظ کی تلاش اور بندش میں اور اپنے خیالات کی رو میں حقیقت واقعیہ سے دور پڑ جاتا ہے اور اسی باعث فوق العادۃ باتیں اکثر بیان کرنے لگتا ہے۔ انگریزی نظم ہرگز ہرگز زبان نہیں سکھاتی۔ نہ اُس میں ردیف اور قافیے کی پابندی ہے، اسی وجہ سے اخلاق کا بیان نہایت سادہ اور دلنشین ہوتا ہے اور واقعات نفس الامری کا مرقع کھینچنے میں خلاف عادت باتیں لکھنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ شعرائے ہند و پارس میں بہت شاعر ایسے گزرے ہیں جنھوں نے تغزل میں بھی بیشتر آداب و اخلاق کے مضامین نہایت قابل قدر لکھے ہیں اور سیکڑوں مفید اور بکار آمد مضامین باندھے ہیں۔ اور با ایں ہمہ

صنعت شاعری کا پورا پورا برتاؤ کیا ہے۔ میں آپ کی اجازت سے اس وقت چند اشعار امیر لکھنوی کے سناؤں گا جو بالکل خط و خال کے مضامین سے معرّا ہیں، جن سے بخوبی ثابت ہوگا کہ نظم اُردو میں بھی کس قدر تجربے کے مضامین باندھے گئے ہیں۔ اس سے میرے دو مطلب ہیں۔ ایک تو یہ کہ معترضین کے اعتراض کی رد ہو اور دوسرا یہ کہ جو لوگ عشقیہ مضامین باندھنے کے عادی ہیں اُن کو معلوم ہو جائے کہ جب امیر ایسے اُستاد کامل فن نے ایسے مضامین باندھے ہیں تو تبعین کو پیروی و تقلید کرنے میں ہرگز مضائقہ نہیں، بلکہ ملک اور قوم کی ضرورتیں داعی ہیں کہ ایسے مضامین بکثرت باندھے جائیں۔

خاموشی کی تعریف کرتا ہے تو کیا بلیغ تمثیل دیتا ہے جو اُسی قدر نرالی ہے جس قدر بلیغ ہے۔ کہتا ہے کہ:۔

خاموشی ——

زباں خاموش رکھ اے دل کہ قابو ہو نہ دشمن کا
حقیقت میں ہے زنگِ کارواں جاسوس رہزن کا

رفاہ عام ——

وہ ہوں راحت رسانِ خلق، مر کر بھی یہ حسرت ہے
چراغ اگر کوئی مفلس اٹھا لے جائے مدفن کا

سخت بات کی چوٹ ——

معاذاللہ کیا زخمِ زبان خلق کاری ہے
گلی شمشیر میں بھی کاٹ ہے شمشیر آہن کا

راحت دنیا کی ناپائداری ——

زمانہ دے اگر راحت، پیام مرگ جان اُس کو
کہ حلوا زہر سے خالی نہیں ہے دست رہزن کا

اہل حرص کی محرومی

جو اہل حرص ہیں نعمت میں بھی محروم راحت ہیں
دہاں بند ایک دَم کھلتا نہیں ہے گاوخرمن کا

تملق دشمن ناقابل اعتبار

قدم سے جو لگے ہیں آج کل دیں گے تجھے ایذا
کہ نعل آہنیں دیکھا ہے آلہ داغ توسن کا

رحم دلی

کسی کو پیچ میں دیکھا دل اپنا رحم سے ٹوٹا
خس گرداب دریا سنگ ہے ہم کو فلاخن کا

دشمن کو حقیر نہ سمجھو

ایک سمجھو جان کا دشمن ہو چھوٹا یا بڑا
کام وقت ذبح کرتی ہے چھری تلوار کا

پیری میں کمال کو فروغ ہوتا ہے

عہد پیری میں کمال اپنا ہوا رونق پذیر
دن ڈھلا جب وقت آیا گرمی بازار کا

مذاق عارفانہ

کعبہ و دل دونوں گھر اُس کے ہیں پراتنا ہے فرق
دور کی وہ راہ ہے یہ راستہ نزدیک کا

ظالموں پر ظلم روا ہے

ظلم اہل ظلم پر کچھ ظلم میں شامل نہیں
کون غارت گر ہے مجرم خانہ زنبور کا

تواضع سے جھکنا چاہیے

جھکے جو آپ سے انساں کو جھکنا اُس سے لازم ہے
جو خم شمشیر میں پایا گیا خم ہم نے گردن کو

دشمن کا دفعیہ احسان ہے

عدو کی سرکشی موقوف ہو جاتی ہے احساں سے
یہ وہ ہے بوجھ بھاری جو جھکا دیتا ہے گردن کو

پشیماں ہوں گے جو قصد شکست غیر رکھتے ہیں — دوسروں کا نقصان چاہنے والا پشیمان ہوتا ہے
بجز سرگشتگی حاصل ہے کیا سنگ فلاخن کو

حریصوں کو سوائے سوز غم نعمت سے کیا حاصل
کہ جلتا ہے فتیلہ جس قدر پیتا ہے روغن کو — حریص زیادہ متفکر ہوتا ہے۔

بلا سے امن اگر چاہے کوئی پیدا حمایت کر
ہوا گل کر نہیں سکتی چراغ زیر داماں کو — حمایت کے سبب بلا سے امن

سوا تذلیل کے کیا ہے غرض جب درمیاں آئی
کہ اونچا ہاتھ منعم کا ہے نیچا ہاتھ سائل کا — غرض باعث ذلّت ہے —

فروتن واجب التعظیم ہیں کچھ شک نہیں اس میں
جھکی مقتول کی گردن تو اُٹھا ہاتھ قاتل کا — انکسار میں توقیر ہے ——

صاحبو! آپ نے غور فرمایا ہوگا کہ کس قدر سچے مضامین ہیں اور قدرت و عادت کے مطابق واقع ہوئے ہیں، باایں ہمہ صنعت شعری کا پورا برتاؤ کیا گیا ہے۔ اس پر مستزاد یہ ہے کہ زبان کس قدر منجی ہوئی ہے اور پاک صاف اور شستہ ہے گویا آب کوثر میں دُھلی ہوئی ہے۔ کوئی لفظ دبتا ہوا نہیں۔ کوئی حرف گرتا ہوا نہیں۔ یہی کیفیت فارسی میں میرزا محمد علی صائب اصفہانی کی ہے۔ اُس کے چند اشعار بطور مُشتے نمونہ از خروار، نذر سامعین باتمکین کیے جاتے ہیں۔

امید فیض ز نو دولتاں مجو صائب
کہ نونہال کجا طاقت ثمر دارد — نو دولت، بے فیض ہوتے ہیں۔

سخی کو بے زری سے شرمندگی

صائبا خجلت سائل بزمینم درکرد
بے زری کرد بمن آنچہ بقاروں زرکرد

عیب پوشی ——————

بپوش چشم خود از عیب دیگراں صائب
اگرچہ می نتوانی برہنہ پوشیدن

دشنام دہی عیب ہے ——

دہن خویش بدشنام میالا صائب
ایں زر قلب بہرکس کہ دہی باز دہد

مانگنے میں بے آبروئی ——

دست طمع بہ پیش کسے کردہ دراز
پل بستہ اکہ بگزری از آبروئے خویش

تملق دشمن آفت جاں ——

اگر دشمن دوتا گردد بہ تعظیمش مشو غافل
کمر خم کردن صیاد آفت جان مرغان است

حضرات انجمن! بزم مشاعرہ میں بڑی خوبی یہ ہے کہ مختلف المراسم اور مختلف المذاہب حضرات یکجا جمع ہوتے ہیں، جو بلا خیال ملت و مذہب کے باہم دوستانہ برتاؤ اور برادرانہ اتحاد سے پیش آتے ہیں اور علوم وفنون کی تازگی کے سوا اس سے اتفاق باہمی بھی بڑھتا ہے، جس کی ضرورت اس وقت ہم لوگوں کو زیادہ ہے۔ پس ایسے جلسوں کو مغتنمات سے شمار کرنا چاہیے۔

یہ ہم جلیس یہ جلسے ہیں بزم ہستی تک
لحد میں کوئی کسی کا شریک حال نہیں

خدا نے دی ہے عجب منزلت محبت کو
یہ بزم وہ ہے کہ جس میں صف نعال نہیں

رامائن پر ایک نظر

بتاریخ ۲۵ر اکتوبر ۱۹۳۱ء پروفیسر کمار صاحب رئیس لاہور جو تھیوزافیکل سوسائٹی کے ایک رکن اعظم ہیں، بمقام سرستی بھون تشریف لائے اور ایک جلسۂ عام زیر صدارت مشران صاحب منعقد ہوا - موصوف نے اس جلسے میں حسب ذیل خطبہ صدارت ارشاد فرمایا :-

بھائیو اور بہنو! مجھے پہلے آپ سب صاحبوں کا شکریہ دلی ادا کرنا چاہیے کہ آپ نے مجھے اس جلسے کی صدارت دے کر میری عزت افزائی فرمائی- نہایت خوشی کا مقام ہے کہ ہمارے مہمان عالی شان پروفیسر کمار صاحب اس جلسے میں رونق افروز ہیں اور اُس کی زیب وزینت کا باعث ہو رہے ہیں- پروفیسر صاحب کو آپ صاحبوں سے روشناس کرنے کے لیے میں زیادہ طویل تقریر کرنا نہیں چاہتا، کیونکہ چند مرتبہ پہلے بھی پروفیسر صاحب کا خیر مقدم، ہم لوگ اس شہر میں کر چکے ہیں اور اُن کا نام نامی تھیوزافیکل سوسائٹی کے رکن اعظم کی حیثیت سے پنجاب اور اضلاع متحدہ میں معروف ومشہور ہے- اس وقت ہمارے دوست، پروفیسر صاحب موصوف رامائن پر لکچر دیں گے، جو برگزیدہ عالم اور فخر بنی آدم، مقتدائے عالمیاں اور پیشوائے جہانیاں یعنی شری رام چندر جی اور ملکۂ فردوس جاہ، مادرِ گیتی پناہ یعنی شری سیتا مہارانی کے

سوانح حیات کی ایسی یادگار ہے، جس کو ۲۴ کروڑ ہندو حرزِ جاں بنائے ہوئے ہیں۔

حضرات! یہ رامائن یادگار ہے اُن بے نظیر اور مشہورِ عالم بہادروں کی، جنھوں نے لشکرِ جرار سمندر پار لے جاکر راون کے ایسے زبردست شہنشاہ کو شکستِ فاحش دی، لیکن اُس کی سلطنت کو مثل شاہانِ دنیا کے اپنی سلطنت میں شامل نہیں کیا۔ بلکہ اُسی کے خاندان کے ایک بھائی کو وہ سلطنت بخش دی۔ جس سے مراد یہ تھی کہ راون راج جو ظلم و ستم کی یادگار تھا دنیا سے مٹا دیا جائے اور عدل و رحم کی حکومت یعنی رام راج دنیا میں قائم ہو۔

یہ رامائن یادگار ہے اُس سعادتمند فرزند ارجمند کی جس نے صرف اپنے باپ ہی کے حکم کی متابعت میں نہیں، بلکہ اپنی سوتیلی ماں کے حکم کی تعمیل میں، سلطنت جیسی عزیز چیز کو چھوڑ دیا اور چودہ برس جنگلوں اور بیابانوں میں بود و باش اختیار کی۔ مجبوری سے نہیں، بلکہ نہایت مسرت سے، اپنا فرض مذہبی و اخلاقی سمجھ کر۔ پھر اس جلا وطنی میں بھی اس بے نظیر بہادر نے وہ بے بہا خدمتیں انجام دیں جو کسی سے نہ ہو سکی تھیں، یعنی پہاڑوں اور جنگلوں کو اُن شیاطین سے پاک و صاف کر دیا جو رشیوں اور مُنیوں کی عبادت میں خلل ڈالتے تھے۔ ان بیہڑ بیابانوں میں وہ ہر وقت دیووں اور جنوں، درندوں اور زہریلے حشرات الارض سے دوچار رہتا تھا، جو اُس کے خداداد تصرّف کے آگے سر جھکا دیتے تھے۔

یہ راماین یادگار ہے اُن خاتونِ عالی قدر و عالی منزلت کی، اُن عفت مآب عصمت جناب بی بی کی، جنھوں نے شاہی محلوں میں ناز و نعمت سے پرورش پائی تھی، لیکن شوہر کے ساتھ جنگلوں اور بیابانوں میں کانٹوں پر اس خوشی سے چلتی تھیں، گویا پھولوں کے فرش پر چل رہی ہیں۔

یہ راماین یادگار ہے اُن سوتیلے بھائیوں کی سچّی محبت کی، جنھوں نے اپنے بڑے سوتیلے بھائی کی جدائی میں سلطنت کرنا گوارا نہ کی اور ایسی عزیز چیز چھوڑ دی جس کی برابر دنیا میں کوئی چیز پیاری نہیں، جس کے لیے بھائی بھائی کے خون کا پیاسا رہتا ہے، جس کے حاصل کرنے کے لیے باپ بیٹوں کو ہلاک کر دیتا ہے، اُن کی آنکھیں نکلوا لیتا ہے اور بیٹے باپ کو قتل کرا دیتے ہیں یا اُس کو قید کر دیتے ہیں۔

یہ راماین یادگار ہے اُن محبت کرنے والے بھائیوں کی، جنھوں نے سلطنت کا لطف چھوڑ کر اپنے جلاوطن بھائی کو جنگلوں میں ڈھونڈھنا شروع کیا، تاکہ اگر وہ روٹھ گیا ہو تو اُس کو منا لائیں اور اُسی کو تخت پر بٹھائیں اور خود اُس کی خدمت کا شرف حاصل کریں۔ لیکن جب دیکھا کہ ہمارا بھائی اپنے عہد پر مضبوط ہے اور جب تک چودہ۱۴ برس گزر نہ جائیں گے کبھی وطن واپس نہیں آسکتا، تو پھر نہایت خوشی اور مسرت دلی سے (نہ کہ مایوسی سے) اپنے بڑے بھائی کی کفش پا، یعنی کھڑاؤں نہایت تعظیم و تکریم سے لے کر اپنے سر آنکھوں پر چڑھائی اور بھائی کے بجائے اُسی کو تخت سلطنت کی مسند شاہی پر رکھ دیا اور خود اُس کے سامنے کمر بستہ اور دست بستہ کھڑے ہو رہے

اور سلطنت کا کام، مشیروں اور وزیروں کی مانند، خادموں اور غلاموں کی طرح، بخوبی تمام، اُس وقت تک انجام دیتے رہے، جب تک صادق الاقرار رام چودّہ برس گزار کر، جنگل سے واپس آئے۔

بھائیو اور بہنو! ہمارے کرۂ ارضی کی پیدائش کو دو ارب اور چار سال شمسی گزرے ہیں، جو ڈاکٹر مولٹن کے حساب سے مطابق ہیں، جو کہ یورپ میں سب سے بڑا مہندس گزرا ہے۔ کیا دنیا میں کوئی ملک، کوئی قوم اور کوئی جماعت، ایسا سعادتمند فرزند ارجمند پیش کر سکتی ہے، جیسے کہ شری رام چندر جی تھے؟ کیا زمانے میں کوئی ملک، کوئی قوم اور کوئی جماعت اس مدت دراز میں ایسی عالی قدر، عالی منزلت اور شوہر پرست خاتون دکھا سکتی ہے، جیسی کہ شری سیتا مہارانی تھیں؟ کیا کوئی ملک، کوئی قوم اور کوئی جماعت اس دوّ ارب کے زمانۂ دراز میں ایسے محبت کرنے والے اور جاں نثار بھائی بتا سکتی ہے، جیسے کہ شری رامچندر جی کے بھائی لچھمن جی اور بھرت جی تھے؟ ہر گز نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ زمانہ قیامت تک خود کفِ افسوس ملتا رہے گا کہ افسوس میں نے ایسے بے نظیر اور عدیم المثال لوگوں کو ہمیشہ کے لیے اپنے ہاتھ سے کھو دیا۔

صاحبان والاشان! میں شری رام چندر جی کے عشق میں ایسا متوالا اس وقت ہو گیا کہ مجھے کچھ ہوش نہیں رہا کہ ہمارے مہمان عظیم الشان، عالی جناب پروفیسر صاحب لکچر دینے کے لیے اس بزم سخن میں رونق افروز ہیں اور آپ سب لوگ اُن کی تقریر دلپذیر سننے کے شائق ہیں۔ میں کہاں سے کہاں

پہونچ گیا۔ میری تقریر طول کھینچ گئی ۔ اب میں آپ سب بھائیوں اور بہنوں کی خدمت میں عرض کرتا ہوں کہ آپ پروفیسر صاحب کا کلام فصاحت نظام بگوش دل سنیں ۔ میں امید کرتا ہوں کہ آپ اُن کی پوری داد دیں گے اور ہماری بہنیں بھی جو کہ خوش قسمتی سے اس جلسے میں شریک ہیں ، راماین کی مذہبی اور اخلاقی داستانوں کو بڑے شوق اور دلچسپی سے سنیں گی۔ اب میں جناب پروفیسر صاحب کی خدمت عالی میں باادب عرض کروں گا کہ پلیٹ فارم پر تشریف لائیں اور سامعین باتمکین کو اپنی جادو بیانی اور شیوہ زبانی سے محظوظ فرمائیں ۔

ہندو یونیورسٹی کے لیے چندے کی اپیل

ماہ جولائی سنہ ۱۹۱۱ء۔ بمقام فتحگڑھ، ہندو کالج کمیٹی کا ایک جلسۂ عام اس غرض سے منعقد کیا گیا کہ یونیورسٹی کے اغراض و مقاصد عوام پر ظاہر کیے جائیں اور اُس کے واسطے چندہ جمع کر کے صدر مقام (بنارس) بھیجا جائے۔ مشران صاحب نے اس جلسے میں حسب ذیل تقریر کی:۔

جناب صدر اور حضرات انجمن!

آج ہم لوگ ایسے مبارک کام کے لیے جمع ہوئے ہیں، جو ہمارے ملک و قوم کے داخلی و خارجی فائدوں پر مشتمل ہے۔ اس سے زیادہ مبارک کام کوئی دوسرا نظر نہیں آتا، جس سے بئیس کرور ہندوؤں کو اخلاقی، معاشرتی اور سیاسی فائدے پہونچیں گے اور اُن کے مذہب کی عظمت قائم ہوگی، یعنی یہ کہ بنارس جیسے متبرک مقام میں، جہاں بڑے بڑے محبان وطن پروفیسروں نے اعلیٰ درجے کا ایثار قابل یادگار کر کے سنٹرل ہندو کالج قائم کیا ہے، وہاں ہندو یونیورسٹی قائم کی جائے۔ اس وقت جبکہ ہمارے مسلمان بھائی مسلم یونیورسٹی کا کام انجام کے قریب پہونچا چکے ہیں، ہم ہندو جو مال و دولت میں اُن سے بہت زیادہ ہیں پیچھے نہ رہ جائیں۔ ہماری خواہش ہے کہ ہندو یونیورسٹی کا کام جلد اختتام کو پہونچائیں اور اُس کے مراتب ابتدائی کا انجام، اس قدر جلد کریں کہ ہمارے شہنشاہ معظم، جارج پنجم، جو ہندوستان تشریف لانے والے ہیں،

بنفس نفیس ہم کو یونیورسٹی کا چارٹر (فرمان) عطا کریں۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ یونیورسٹی قائم کر کے اپنی قومی تعلیم اپنے ہاتھ میں لے لیں، تاکہ ہماری تعلیم میں جو کچھ سقم ہوں، وہ یکقلم دور ہو جائیں۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ عمدہ تعلیم نہ ہونے سے، جو ہندوؤں کے مذہبی خیالات میں لغزش پیدا ہو گئی ہے، وہ جاتی رہے اور ہماری تعلیم و تربیت کا قصرِ عالیشان ایسی مستحکم بنیادوں پر قائم ہو، جن کو انقلاب کا بے پناہ سیلاب بھی نہ ہلا سکے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے ملک میں ویسے ہی ماہر اور کامل لوگ پیدا ہو جائیں، جیسے یورپ میں پیدا ہوئے، جن سے انگلستان، فرانس اور جرمنی وغیرہ کا نام آفتاب و ماہتاب کی مثل روشن ہے۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے ہزاروں طلبہ، جو افلاس کے باعث زیادہ نہیں پڑھ سکتے، اُن کی وظیفوں کے ذریعہ، معاونت کریں اور مثل یورپ کے، فیلوشپ کے وظیفے جاری کر کے اپنے ملک میں ذرائع تعلیم کو توسیع دیں تاکہ ہم کو بھی ایجاد و اختراع پر قدرت حاصل ہو اور ہماری قوم، دنیا کی متمدن قوموں میں شمار ہونے لگے۔ ہندو کالج یہ چاہتا ہے کہ سنسکرت۔ اور ہندو مذہب و اخلاق کی تعلیم لازمی سمجھی جائے، جس سے اس وقت ہندو اپنی بدقسمتی سے محروم ہو گئے ہیں، تاکہ ہندوؤں کی قوم ہندو رہ کر ترقی اور عروج حاصل کرے اور ان کے دلوں میں پُرانے بزرگوں، رشیوں اور مرتاضوں کی عظمت قائم ہو جائے اور پُرانے علوم روحانیہ اُن کے دلوں اور دماغوں مین جاگزیں ہو جائیں اور اُن کو اپنے برگزیدہ اسلاف کے پسندیدہ کارناموں کی ریس کرنے کا شوق دامنگیر ہو۔ ہندو کالج یہ چاہتا ہے کہ

مغربی اور مشرقی علوم پہلو بہ پہلو چلیں اور ہر ہندو جبکہ وہ علوم مادّی میں طاق ہو تو اپنے مذہب و اخلاق اور پاکیزہ خیالات میں بھی شہرۂ آفاق ہو۔ ہندو کالج کا منشا یہ ہے کہ نہ صرف مذہبی و اخلاقی تعلیم ہی دی جائے بلکہ یہ نگرانی بھی کی جائے کہ ہر ہندو طالب علم اپنے اصول مذہبی و اخلاقی پر روزمرّہ کی زندگی میں عملدرآمد کرے اور جبکہ اُس کو دنیوی معاش بکثرت میسّر آئے تو اُسی کے ساتھ وہ عقبیٰ کی نعمتوں سے بھی محروم نہ رہے۔ بالفاظ دیگر کالج یہ چاہتا ہے کہ حاکم وقت اور خدا دونوں کی نگاہ میں ہندوؤں کی قوم وقعت وعظمت حاصل کرے اور جبکہ وہ کاروبار دنیوی میں اور نظم ونسق ملکی میں بہرہ کافی ووافی حاصل کریں اور تجارت بین الاقوامی اور علوم و فنون کی دولت سے بہرہ مند ہوں، تو اسی کے ساتھ ساتھ علوم روحانیہ اور دولت عقبیٰ سے بھی مالامال ہو جائیں۔ غرضکہ ہندوؤں میں وہ اخلاق پسندیدہ اور اوصاف حمیدہ پیدا ہو جائیں جو قدیم آریوں کے لیے باعث افتخار تھے۔

یونیورسٹی کیا چیز ہے —؟ اس کی ضرورت ہمارے ملک میں کس قدر ہے —؟ اور ہندو یونیورسٹی کے قیام سے کیا کیا فوائد ہوں گے —؟

صاحبان ذیشان! یونیورسٹی ایک جماعت علماء کا نام ہے، جو تعلیم و تربیت کا انتظام کرتی ہے۔ اور اُس کے قواعد وضوابط منضبط کرتی ہے اور تعلیم حاصل کرنے والوں کو ڈگریاں یعنی سندیں دیتی ہے۔ یونیورسٹی دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک تو امتحان لینے والی (یعنی ممتحنوں کی جماعت) جیسے لندن یونیورسٹی اور دوسری وہ جو علاوہ امتحان لینے کے تعلیم وتربیت بھی

دے ۔ جیسے آکسفرڈ اور کیمبرج یونیورسٹی ۔ لندن یونیورسٹی میں بورڈنگ (یعنی دارالاقامہ) نہیں ہے، اس لیے اُس کو مذہبی اور اخلاقی تعلیم وتربیت سے کوئی واسطہ اور سروکار نہیں۔ آکسفرڈ اور کیمبرج میں انجیل پڑھائی جاتی ہے اور ایک دوسری کتاب جو مذہب عیسوی کے ثبوت میں ہے وہ بھی کورس یعنی نصاب میں داخل ہے ۔ لندن یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ آکسفرڈ اور کیمبرج کے گریجویٹ کے سامنے شرماتے ہیں ۔ کیمبرج یونیورسٹی سے ۱۹ کالج الحاق رکھتے ہیں اور تین ہزار طالب علم ہیں ۔ اُس کی آمدنی مہاراجا گوالیار سے زیادہ ہے ۔ گورنمنٹ اُس کے انتظام میں کچھ دخل نہیں دیتی ۔ یونیورسٹی کے فیلو، ہوتے ہیں، جن کو تین ہزار روپیہ سالانہ وظیفہ ملتا ہے، اُن سے کوئی خدمت نہیں لی جاتی، بلکہ بطور پنشن یہ رقم اس غرض سے دی جاتی ہے کہ وہ لوگ فراغت اور اطمینان سے کسی علم یا فن میں خاص طور پر لیاقت اعلیٰ حاصل کریں اور عمدہ اور بکار آمد کتابیں تصنیف وتالیف کرتے رہیں ۔

یہ باتیں ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں کہاں ہیں ۔ یہ سب یونیورسٹیاں گورنمنٹ کی طرف سے قائم ہوئی ہیں اور وہی اُن کی منتظم ہے ۔ یہ سب یونیورسٹیاں لندن یونیورسٹی کے نمونے پر ہیں یعنی ممتحنوں کی جماعت ہیں ۔ تربیت اور اخلاقی تعلیم ان میں نہیں ہوتی ۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے یہاں انگریزی تعلیم یافتگان کی جماعت ایسی پیدا ہوگئی ہے جس کو اپنے مذہبی علم ادب اور آبائی تہذیب وشائستگی اور اپنے ملک وقوم کے رسم ورواج سے

نفرت پیدا ہو گئی ہے - لہذا ہمارا مقصود ایسے انگریزی خوانوں سے پورا نہیں ہوتا - جب ہماری خود مختار یونیورسٹی ہو گی تو وہ بھی مثل کیمبرج یونیورسٹی کے کام کرے گی - تعلیم کے کورس یعنی نصاب بنائے گی - گورنمنٹ کو اُس کے اندرونی انتظام میں دخل نہ ہو گا - ہم مذہبی فلسفے کی تعلیم دے سکیں گے - ہمارے قومی علم و ادب کو ترقی ہو گی اور ہمارے یہاں بھی مثل کیمبرج کے فیلو ہوا کریں گے جو وظیفوں کی امداد سے مختلف علوم و فنون میں دستگاہ کامل حاصل کر کے عمدہ عمدہ کتابیں تصنیف و تالیف کیا کریں گے - پھر ہماری قوم دنیا کی مہذب اور شائستہ قوموں میں داخل ہو جائے گی اور دنیا و عقبیٰ دونوں میں بہبود و فلاح کے سامان ہم جمع کر سکیں گے -

یاد رکھنا چاہیے کہ اعلیٰ درجے کی تعلیم قومی عزت و ترقی کا اصلی ذریعہ ہے ـــ اور کوئی قوم عزت نہیں پا سکتی، جب تک اعلیٰ تعلیم اُس قوم میں ایک حد مناسب تک شائع نہ ہو گئی ہو - اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اُس حد مناسب کی تعریف کیا ہے اور اُس کا اندازہ کیونکر کیا جائے؟ حد مناسب سے مراد یہ ہے کہ (۱) ضروری ہے کہ اُس قوم میں ایک گروہ جس کو آبادی کے فی صدی اوسط کے لحاظ سے معقول اور مناسب تعداد کہا جا سکے، ایسا اعلیٰ تعلیم یافتہ ہو کہ جو مختلف علوم و فنون میں ماہر اور کامل ہو اور جس کی عقل و علم اور سعی و کوشش سے علم و فن کو روز بروز ترقی گوناگوں ہو اور جس کا نام قومی عزت کا ذریعہ قرار پائے (۲) اس گروہ کے علاوہ ایک بہت بڑی جماعت متوسط درجے کی تعلیم یافتہ اُس قوم میں پائی جائے، جو عالی مرتبہ

مصنفوں کی علمی تصنیفات کو نہایت عمدگی سے جانتی ہو اور دقیق نکات اور اصول سے بخوبی واقف ہو اور علمی تصنیفات کا ترجمہ اپنی زبان میں کر سکے۔ یہ گروہ مردم شماری کے لحاظ سے قوم کے افراد کے ساتھ ایک معتد بہ مناسبت رکھتا ہو۔ (۳) اس کے بعد ادنیٰ درجے کے تعلیم یافتہ لوگ نہایت کثرت سے ہونا ضروری ہیں، جو اپنے دینی اور دنیوی کاموں کو بخوبی انجام دے سکتے ہوں۔ جو ترقیاں علوم و فنون کی ہوتی رہتی ہیں، اُن سے فائدے اُٹھا سکتے ہوں، آسان کتابیں اور چھوٹے چھوٹے آسان اخبار پڑھ سکتے ہوں اور معمولی نوشت و خواند اور حساب کتاب جانتے ہوں۔

اب دیکھنا چاہیے کہ اول درجے کے ماہرین و کاملین، جن کا بیان ہو چکا ہے، وہ ہم میں کتنے ہیں۔ میں کہوں گا کہ وہ مطلق نہیں ہیں۔ کتنے ہیں ہندوستان کے گریجویٹ، جو ماہر اور کامل کا درجہ رکھتے ہیں؟ علوم طبعیات، علم حیوانات، علم نباتات، علم طبقات الارض میں کتنوں کو عبور حاصل ہے؟ اتنے نامی و گرامی وکلا، ہندوستان میں ہیں، اُن میں کتنے ہیں جو مستقل قانون بنا کر پیش کر سکتے ہیں؟ اسی طرح دوسرے اور تیسرے درجے کے لوگ ہیں۔ گو یہ کسی قدر تعداد میں پہلے گروہ سے زیادہ ہیں مگر پھر بھی اتنے کم ہیں کہ مردم شماری کے لحاظ سے اُن کو قوم کی افراد سے کوئی معقول مناسبت نہیں۔ جب یونیورسٹی قائم ہو جائے گی، تو یہ سب کچھ ہو جائے گا۔ یعنی تینوں درجوں کے اشخاص کثیر تعداد میں ہمارے یہاں ہونے لگیں گے اور ہماری قوم دنیا کی مہذب قوموں میں داخل ہو جائے گی۔

اعلیٰ تعلیم کے فوائد

صاحبان ذیشان! ملک وقوم کی عظمت وترقی صرف اعلیٰ تعلیم پر منحصر ہے۔ کیا معاش، کیا معاد، کیا دنیوی جاہ وحشم، کیا عقبیٰ کا بخیر انجام، یہ سب اعلیٰ تعلیم کی برکات عظیمہ ہیں۔ اعلیٰ درجے کی تعلیم ملک وقوم کی دولت وعزت کی بنیاد ہے۔ قوم کو پستی مذلت سے اُبھارنے کے واسطے اعلیٰ تعلیم کی شدید ضرورت ہے تعلیم سے حواس باطنی وظاہری بیدار ہوجاتے ہیں۔ اُس بیداری سے اچھائی اور بُرائی، اور نیکی اور بدی کی تمیز پیدا ہوتی ہے۔ اس تمیز سے اچھی باتوں کی طرف میلان اور رجحان ہوتا ہے۔ اس میلان اور رجحان سے مستعدی اور محنت کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ محنت ومستعدی سے کامیابی حاصل ہوتی ہے اور اسی کامیابی سے قومی عزت اور دولت وحشمت کو ترقی ہوتی ہے۔ اگر سوال کیا جائے کہ ہماری موجودہ بُری خصلتیں اور عادتیں کیونکر دور ہوسکتی ہیں؟ تو جواب یہ ہوگا کہ اعلیٰ تعلیم وتربیت کے شائع کرنے سے۔ اگر پوچھا جائے کہ قوم میں غیرت اور حمیت کیونکر پیدا کی جائے اور اُس کو پستی مذلت سے اُبھار کر اوج کمال پر کیونکر پہونچایا جائے؟ تو جواب یہ ملے گا کہ موجودہ اور آئندہ نسلوں کو اعلیٰ درجے کی تعلیم وتربیت دینے سے۔ اگر آپ پوچھیں کہ موجودہ رشک وحسد اور نفاق کے دور کرنے کا کیا علاج ہے؟ تو میں جواب دوں گا کہ اعلیٰ تعلیم۔ اگر سوال کیا جائے کہ ہندؤوں کو اپنے قدیم آباؤ اجداد کی لائق اولاد بنانے کے لیے کیا کرنا چاہیے؟ تو جواب یہ ہے کہ اعلیٰ درجے کی مذہبی اور اخلاقی تعلیم کی اشاعت۔ قوم کو ترقی کے مدارج پر پہونچانے کے لیے

عمدہ تدبیر یہ ہے کہ بچوں کو باقاعدہ مذہبی اور اخلاقی تعلیم دی جائے، تاکہ اُن کی بنیاد درست ہو۔ طلبہ کو بذریعہ وظائف تقویت پہونچائی جائے اور اُن کے واسطے عمدہ تعلیمی سامان فراہم کیے جائیں تاکہ وہ فارغ التحصیل ہوکر ہندی قوم تیار کرنے کے اہل ہوں۔ ان پر بے دریغ روپیہ خرچ کیجیے، کیونکہ انھی پر ملک کا بھروسا ہے۔ انھی سے قوم کا آسرا ہے۔ ہم لوگ کھیت جوتنا نہیں چاہتے، نہ تخم ریزی و آبیاری کرنا چاہتے ہیں لیکن حاصل کے وقت خرمن جمع کرنا چاہتے ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے۔ ع

ایں خیال ست و محال ست و جنوں

حضرات! یاد رکھیے کہ ہر زمانے میں عظمت و بزرگی کا ایک مقیاس ہوتا ہے، جس سے آپ بزرگی کا تخمینہ کر سکتے ہیں۔ پہلے ہندوستان میں کوئی وقت تھا، جس کو HEROIC AGE کہتے ہیں یعنی وہ زمانہ جبکہ بہادری و شجاعت ہر شخص کے لیے بزرگی و عظمت کا باعث تھی۔ مگر اب جس طرح یورپ میں قاعدہ ہے ہندوستان میں بھی ہے، کہ شخصی عظمت، قومی عزت و دولت پر موقوف ہے۔ اب وہ وقت بہادری کا ہندوستان میں نہیں رہا جو رومیہ کبریٰ میں تھا، جبکہ CINCINNATUS نے آلات زراعت چھوڑ کر آلاتِ حرب اٹھا لیے تھے اور شیوۂ طعن و ضرب اختیار کر لیا تھا بلکہ اب صلح اور امن و اماں کا زمانہ ہے جس میں دولت بڑی چیز سمجھی جاتی ہے اور وہی قومیں دنیا میں مہذب اور زبردست سمجھی جاتی ہیں جو زیادہ دولتمند ہیں۔ اب بحث پیدا ہوتی ہے کہ دولت کس طرح پیدا کی جائے؟ اس کا جواب سوا اس کے

کچھ نہیں ہوسکتا کہ علوم وفنون کی اشاعت سے قوم کو مہذب اور تعلیم یافتہ بنایا جائے۔ جس طرح یورپ میں دولت حاصل کرنے کے طریقے اختیار کیے گئے ہیں، وہی ہم کو بھی اختیار کرنا پڑیں گے، ورنہ ہرگز ہرگز قوم مرفہ الحال نہیں ہوسکتی۔

صاحبو! ہم لوگوں کی عادت ہے کہ ہر معاملے میں گورنمنٹ کی آس لگائے رہتے ہیں۔ سیلف ہیلپ (اپنی مدد آپ کرو) کے مسئلے پر عمل نہیں کرتے اور اپنی سعی وکوشش پر بھروسا نہیں کرتے۔ ہم کو جاننا چاہیے کہ ہماری گورنمنٹ NEGATIVE GOVT. ہے، یعنی وہ ہم کو بُرے کاموں کے ارتکاب سے منع کرتی ہے۔ اُس کا فرض یہ نہیں ہے کہ ہم کو اچھے کاموں کی طرف ہر وقت رغبت وتحریص دیا کرے۔ اصل میں گورنمنٹ میں یہ کوئی عیب نہیں ہے، بلکہ بڑا وصف ہے۔ جس کا شکر گزار ہم کو ہونا چاہیے۔ اگر ہم سب کام گورنمنٹ کی تحریک سے کیا کریں گے، تو قوم ہمیشہ دوسروں کی محتاج بنی رہے گی اور اپنے بھروسے پر کوئی کام نہ کرسکے گی۔ ہندو کیا نہیں کرسکتے۔ تمام ملک کی دولت اُن کے ہاتھ میں ہے۔ اُن کی فیاضی مشہور ہے۔ یونیورسٹی کے واسطے دس لاکھ روپیہ کی ضرورت ہے۔ ہزاروں ہندو اِس ملک میں ایسے ہیں، جن میں سے ایک ایک اس ضرورت کو رفع کرسکتا ہے۔ دیکھیے مسٹر ٹاٹا نے تیس لاکھ روپئے یونیورسٹی قائم کرنے کے لیے دے دیے۔ کتنا بڑا کام کیا، جو ہمیشہ یادگار رہے گا اور آیندہ نسلیں فائدۂ کثیر اٹھائیں گی۔

حضرات! اس وقت اگر ہندو قوم پر نظر ڈالیے، تو ہرگز باور نہ ہوگا کہ

موجودہ قوم اُنہی بہادر آریوں اور قدیم مرتاضوں کی نسل میں ہے، جنھوں نے حکمت و فلسفہ اور علوم و فنون مختلفہ کی روشنی چہار دانگ عالم میں پھیلائی تھی، جن کی سچائی، راستبازی اور پارسائی اطراف عالم اور اکناف دنیا میں معروف و مشہور تھی۔ فقط ہم راماین کے زمانے پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ کیسے قول کے سچے اور بات کے پکے لوگ تھے کہ چاہے جان جاتی رہے، اپنے سعادتمند بیٹے سے دائمی مفارقت ہو جائے مگر "قول مرداں جاں دارد" کی ساکھ میں فرق نہ آنے پائے۔ قول جان کے ساتھ تھا۔ بیٹے بھی کیسے والدین کے فرمانبردار تھے کہ سوتیلی ماں کے حکم کی تعمیل میں سلطنت جیسی عزیز چیز سے دست بردار ہو کر ہر قسم کی سختیاں جلا وطنی کی، نہایت خوشی سے فرض مذہبی سمجھ کر گوارا کیں۔ خاتونیں کس قدر فرمانبردار اور شوہر پرست ہوتی تھیں کہ شوہر کے ساتھ جلاوطنی میں اپنی خوشی سے رہ کر جنگلوں اور بیابانوں میں کانٹوں پر اس طرح چلیں، گویا پھولوں کے فرش پر چل رہی ہیں۔ بھائی کس قدر جاں نثار اور نشۂ محبت میں سرشار تھے کہ سوتیلے بھائی کی جدائی میں سلطنت کرنا پسند نہ کیا۔ مگر اس وقت ہندوؤں میں یہ اوصاف پسندیدہ نام کو نہیں پائے جاتے۔ سچائی سے نفرت ہے، باپ بیٹوں میں جنگ و جدل ہونا اور بھائی کا بھائی سے دشمنی کرنا معمولی بات ہے۔ برادر حقیقی دشمن مادر زاد بن جاتا ہے۔ ملک و قوم کے فائدے کا کام کوئی نہیں کرتا۔ اگر بظاہر کوئی کام کرتے بھی ہیں تو اپنا ذاتی فائدہ دیکھ لیتے ہیں۔ خود غرضی ہر شخص کی طبیعت میں داخل ہو گئی ہے۔ اکثر جھوٹے پیٹریٹ (PATRIOT) پیدا ہو گئے ہیں، جو

گورنمنٹ سے خطاب لینے کی خاطر جمہور کے ساتھ بلکہ اپنے خاص عزیزوں اور بھائیوں کے ساتھ ہر قسم کی بدسلوکی کرنے کو تیار رہتے ہیں۔ عوام میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک جہالت و بے علمی کی وبا پھیلی ہوئی ہے۔ قدیم مذہب اور قدیم اخلاق عنقا ہو گیا ہے۔ ع آں قدح بشکست و آں ساقی نماند۔ ہمارے یہاں کے انگریزی تعلیم یافتہ اور گریجویٹ حضرات کی حالت ناگفتنی ہے۔ جن سے کوئی امید فلاح و بہبود کی قوم کو نہیں ہو سکتی۔ یونیورسٹی کے منتظموں کی رائے یہ ہے کہ ملک میں گریجویٹ لوگوں کی جماعت ایسا نیم تعلیم یافتہ گروہ ہے، جن کا علم بالائی ہے، یعنی مبلغ علم وسیع نہیں ہے، جن میں خودبینی بجید ہے۔ وہ تقریر میں لستان ہیں، لیکن اُن کو الفاظ و فقرات کے معنی بھی معلوم نہیں، جن کو وہ دم تقریر و تحریر استعمال کرتے ہیں اور دُہراتے ہیں اور سوائے معاش حاصل کرنے کے کوئی دوسرا فائدہ تعلیم و تربیت سے نہیں سمجھتے ہیں اور معاش بھی سوائے ملازمت سرکاری کے کسی اور جگہ تلاش نہیں کرتے۔

افسوس کہ وہ وقت نہیں رہا کہ بھاسکر اچارج نے سر اسحاق نیوٹن سے ڈیڑھ سو برس پہلے نظام شمسی ہندوستان میں قائم کیا، جس کے انکشاف کا فخر سر اسحاق کو کئی سو برس بعد یورپ میں حاصل ہوا۔ صد حیف کہ وہ زمانہ نہیں رہا کہ حکیم فیثاغورث یونانی نے یہاں آکر نظام شمسی سیکھا اور پھر نظام بطلیموسی کو باطل کیا۔ اُنہی عالموں فاضلوں کی اولاد اس وقت نیم وحشی کہلاتی ہے۔ کہاں تک ہموطنوں اور ہمجنسوں کے عیب بیان کروں سہ

نخواہم دریں باب زیں بیش گفت کہ عیبت بود سیرت خویش گفت

حضرات! گو ہندوؤں میں قدیم آباؤ اجداد کے اوصاف حمیدہ مفقود ہیں لیکن ان کا مذہب صرف ایسا باقی رہ گیا ہے جو قوم کا شیرازہ باندھے ہوئے ہے، وہی ان کا بیڑا پار لگائے گا۔ اے اپنے دھرم کا پالن کرنے والے بھائیو! میں سنتا ہوں کہ مسز بیسنٹ (MRS. BASANT) دس لاکھ روپیے کے واسطے، جس کی ضرورت ہم کو ہندو یونیورسٹی کے لیے ہے، یورپ میں اپیل کرنے والی ہیں۔ کتنی شرم کی بات ہے کہ چوبیس[۲۴] کرور ہندو اپنے ہونہار بچوں اور اپنے مذہب قدیم کی خاطر دس لاکھ روپیہ نہ دے سکیں اور قوم نصاریٰ کی خیرات لینا پسند کریں۔ اگر یہ اپیل کی گئی تو یاد رکھیے گا کہ ہندوؤں کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکا ہمیشہ کے لیے لگ جائے گا اور آیندہ کے مورخین لکھیں گے کہ ہندوؤں سے عیسائی قوم بہت زیادہ نکوکار اور مخیر ہے جس نے باوصف اختلاف مذہب اور اختلاف قوم و ملک کے ہزاروں کوس پر ہندوؤں کے ساتھ سلوک کیا اور ہندوؤں سے باوجود اتحاد مذہب اور اتحاد قوم و ملک کے اپنے بھائیوں اور اپنے بچوں کا فرض انجام نہ دیا گیا۔ میں کہوں گا کہ ایک کالج اور ایک یونیورسٹی کیا! ایسے بڑے ملک میں تو جیسا کہ ملک ہند ہے، سیکڑوں کالج اور بیسیوں یونیورسٹیاں قائم کرنے کی ضرورت شدید ہے۔ ہم لوگ انواع و اقسام کی اصلاحیں کرنا چاہتے ہیں، مگر اصل بنیاد کو نہیں دیکھتے۔ کسی اصلاح کی کوشش نہ کیجیے، صرف علوم و فنون کی اشاعت کیجیے۔ قوم خود مہذب بن کر اصلاحات

کرے گی اور جو مشکلات اب پیش آرہی ہیں، ہرگز کوئی پیش نہ آئے گی۔
اگر میں اپنی اور اپنی قوم کی خوش قسمتی سے ہندوستان کا وائسرائے ہو جاتا، تو
کم ازکم تین[۳] کرور روپیہ بیت المال کا صرف تعلیم و تربیت پر صرف کر دیتا۔
دیکھیے! برطانیہ اعظم و آئرلینڈ میں ساڑھے تین کرور کی آبادی ہے اور
پانچ کرور روپیہ صرف تعلیم پر خرچ ہوتا ہے۔ ہندوستان میں تیس کرور کی
آبادی ہے اور تعلیم پر صرف ایک کرور روپیہ خرچ کیا جاتا ہے۔ ع

تفاوت ہے زمین و آسماں کا

قوم کی عظمت وشان بڑھانا آسان کام نہیں۔ دولت خرچ کی جاتی ہے،
ہزاروں لاکھوں جانیں ضائع کی جاتی ہیں اور خون آب باراں کی طرح بہایا
جاتا ہے، جب کچھ نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔ آپ کو شکر کرنا چاہیے کہ آپ لوگوں
کو اور کوئی تکلیف گوارا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف تعلیم وتربیت پر
خرچ کیجیے۔ ہر قسم کی قومی عزت اور قومی بزرگی وترقی آپ کو حاصل ہوگی۔
مسٹر ٹاٹا کو دیکھیے جنھوں نے تیس لاکھ روپیہ یونیورسٹی قائم کرنے کے واسطے
دے دیا۔ کیا ٹاٹا سے زیادہ کوئی دولتمند نہیں؟ مگر بات یہ ہے کہ "توانگری
بدل ست نہ بمال" ایسے بھی بندگان خدا ہیں کہ "بہ برند و بہ نہند و نخورند و ندہند"
اور ایسے بھی خاصان خدا ہیں، جیسے مسٹر ٹاٹا کہ "صلائے کرم درداده و خوان
نعمت نہادہ طالب نامند و مغفرت و صاحب دنیا و آخرت"۔

صاحبو! میں جو کچھ عرض کر سکتا تھا کر چکا۔ اب میں آخر میں آپ کی
خدمت مبارک میں ہندو مذہب کی طرف سے اپیل کرتا ہوں، جس کی بنیاد

مغربی علوم نے ہلا دی ہے ۔ اُسی بنیاد کے مضبوط کرنے کے لیے، یہ یونیورسٹی قائم کی جا رہی ہے۔ میں آپ کی خدمت میں اُن طلبہ کی طرف سے اپیل کرتا ہوں، جو وہاں تعلیم پاکر ایسی قوم ہندی تیار کریں گے، جو اپنے برگزیدہ اسلاف کی یادگار ثابت ہوگی۔ میں آپ کی خدمت میں چوبیس کرور ہندوؤں کی طرف سے اپیل کرتا ہوں، جو بحیثیت ایک قوم کے یونیورسٹی سے فائدے اُٹھائیں گے۔ میں اُن غریب طلبہ کی طرف سے اپیل کرتا ہوں، جو بیچارے بوجہ افلاس کے زیادہ تعلیم پانے سے محروم رہ جاتے ہیں اور وہ یونیورسٹی قائم ہونے کے بعد وظیفوں کی امداد سے تعلیمی فوائد سے مستفید ہو سکیں گے۔ میں اُن خیر خواہان ملک و قوم کی طرف سے اپیل کرتا ہوں، جنھوں نے اپنی زندگی ہندو کالج کا کام کرنے کے لیے وقف کر دی ہے اور سوائے قوم کے خشک شکریے کے کوئی صلہ کوئی معاوضہ اُنھوں نے اپنے لیے نہیں رکھا۔ اُن محبان وطن کی خاطر اور اُن کا دل بڑھانے کے لیے آپ اس کارِ خیر میں شریک ہوں۔ میں آپ کی خدمت میں اُن قدیم رشیوں، بزرگوں اور آریوں کی طرف سے اپیل کرتا ہوں، جن کا نام بہت بڑا ہے، جن کے نام سے ہم اب تک بکتے چلے آئے ہیں، جن کا نام نامی اب معرض خطر میں ہے اور عنقریب مٹ جائے گا، اگر ہم اُس کو نہ بچائیں گے۔ دیکھیے اُن لوگوں کی ہمت کو، جنھوں نے ہندو مذہب کے علمی دیوتا کی پوجا کے لیے ایک عالیشان مندر بنوانا چاہا ہے۔ آئیے ہم اور آپ سب مل کر اُس عالیشان مندر، اُس قومی درسگاہ کے بنانے میں اُن کا ہاتھ بٹائیں۔ ہم میں سے

بعض مٹی ڈھو ڈھو کر پہونچائیں، بعض اینٹیں اُٹھا کر دیں اور بعض اس میں معماری، انجینیری اور سنگ تراشی کا کام انجام دیں، تا کہ وہ عظیم الشان علم و ادب کا قومی شوالہ بن کر تیار ہو جائے، جس میں ہندوؤں کے علوم بلکہ ہندو مذہب پناہ لینے والا ہے۔

میں آپ کی خدمت میں اُن بیزبان طلبہ کی طرف سے اپیل کروں گا، جو اپنی فریاد آپ کے کان تک نہیں پہونچا سکتے، جو اپنی تعلیمی ضرورتوں کو آپ پر ظاہر نہیں کر سکتے۔ میرا کام ہے کہ اُن کی طرف سے وکالت کروں اور بلند آواز سے شور مچا کر آپ سے عرض کروں کہ آپ چونک پڑیں اور خواب غفلت سے بیدار ہو جائیں اور جان لیں کہ قوم کے ہونہار بچے ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جہالت اور بے علمی میں مبتلا ہیں۔ یاد رکھیے کہ جو زبان اس وقت اُن بیکسوں کے منہ میں خاموش اور بے حس و حرکت معلوم ہو رہی ہے وہی زبان اُس وقت جبکہ ہم اور وہ خدا کے سامنے حاضر ہوں گے، تلوار کی طرح چلتی معلوم ہو گی اور ہم کو ملزم قرار دے گی، کیونکہ ہم نے اپنا قومی فرض ادا نہیں کیا اور اُن غریبوں اور بیزبانوں کے واسطے کوئی قومی درسگاہ بنوانے کا انتظام نہیں کیا۔

میں آپ صاحبوں کی خدمت میں فطرت انسانی کی طرف سے اپیل کرتا ہوں، جس کا اصل خاصہ ہمدردی ہے کہ آپ یہ عظیم الشان تعلیمگاہ قائم کر کے اپنا نام نیک یادگار چھوڑیں۔

مبارک ہیں وہ لوگ، جو دوسروں کے فائدے کے لیے خود تکلیفیں

اُٹھاتے ہیں ! مبارک ہیں وہ لوگ ، جو گری ہوئی قوم کو ابھارنے کی سعی و کوشش کرتے ہیں ! ! مبارک ہیں وہ لوگ ، جنھوں نے ہندو کالج کی بنیاد ڈالی اور مبارک ہیں آپ لوگ ، جو یہاں تشریف رکھتے ہیں اور ہندو یونیورسٹی کے حامی و مددگار رہیں !

تقسیم انعامات کے بعد ــــ!

۸ماہ فروری ۱۹۲۷ء، شریمتی ساوتری دیوی کے پاٹھشالا، واقع فرخ آباد میں تقسیم انعام کا جلسہ ہوا، جس کی صدارت مسٹر جے، ایف، ہیل، صاحب کلکٹر بہادر ضلع نے فرمائی۔ جملہ تقریبات سے فراغت کے بعد، مشران صاحب نے حاضرین جلسہ کے اصرار پر حسب ذیل عالمانہ تقریر کی، جس میں موصوف نے ارتجالاً معلومات کے دریا بہادیے ہیں:-

جناب صدر! ہم سب لوگ آپ کی تشریف آوری کے ممنون اور احسانمند ہیں کہ آپ نے ہمارے پاٹھشالا کے معاملات میں دلچسپی لی اور ہمارے بچّوں کو اپنے ہاتھ سے انعام عطا فرمایا۔ جن لڑکوں نے آج انعام پایا ہے، وہ بہت خوش ہیں اور سال آیندہ بھی اپنا یہ اعزاز و امتیاز باقی رکھیں گے اور جنھوں نے انعام نہیں پایا ہے، وہ استحقاق پیدا کرنے میں جدو جہد کریں گے۔ بہر کیف یہ انعام، تمام طلبہ کے سمند شوق پر تازیانے کا کام کرے گا۔

عالی جاہا! یہ پاٹھشالا، شریمتی ساوتری دیوی کی فیاضی اور علم دوستی کی مجسم یادگار ہے، جنھوں نے ایک ایسا چشمۂ فیض جاری کر رکھا ہے جس کی بدولت ہمارے ہونہار بچوں کو بہت فوائد پہونچ رہے ہیں اور جس کے باعث اس شہر میں تعلیم سنسکرت کا دروازہ کھُل گیا ہے، جو بقول پروفیسر "میکس مولر" کے

اُمّ الاَلسنہ (تمام زبانوں کی ماں) ہے - یہ صرف میرا یا تنہا ہندوستانیوں ہی کا دعویٰ نہیں، بلکہ اس کی تائید، یورپ کے ماہرین علم زبان نے بھی جابجا کی ہے اور علمائے مصر و عرب نے بھی تسلیم کیا ہے اور تاریخ سے بھی اس دعوے کی تصدیق ہوتی ہے - ہماری زبانِ سنسکرت میں قریب قریب تمام وہ مادّی اور روحانی علوم، پہلے سے مدوّن ہیں، جن پہ آج یورپ کو ناز ہے -

سیاحوں اور مورخوں کے اقوال سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ تمام علوم و فنون، اول ہندوستان سے اُن یونانیوں نے حاصل کیے جو سکندر اعظم کے ساتھ ہندوستان آئے تھے، پھر یونان کے ذریعہ تمام یورپ اور مصر و عرب میں ان کی اشاعت ہوگئی - عرب میں یہ علوم براہ راست بھی پہونچے، چنانچہ تاریخ عرب کے زریں اوراق اس کے شاہد ہیں کہ عربی زبان میں آج جس قدر علوم و فنون کا ذخیرہ ہے، ان میں اکثر و بیشتر سنسکرت کی مہتم بالشان اور مستند کتابوں سے ترجمہ ہوئے ہیں، جو خلیفہ ہاروں رشید عباسی کے دور سلطنت میں علمائے ہند کو عرب میں بُلا کر حاصل کیے گئے اور اُن سے اپنی زبان عربی میں لکھائے گئے - چنانچہ منکا وید اور سالی (جس کو اہل عرب صالح کہتے ہیں) کی تصانیف، جو کہ عربی زبان میں ہیں، سنسکرت کی تصنیفات سے حرف بحرف مطابقت رکھتی ہیں مضمون یکساں ہے، صرف بولی کا فرق ہے - روح ایک ہے، صرف جسم کا امتیاز ہے -

علم حدیث کے ماہرین اس حقیقت سے واقف ہیں کہ ہاروں رشید سے

بہت پہلے، خود رسول اسلام حضرت محمد مصطفیٰ صلعم نے بھی یہ ارشاد فرمایا ہے کہ اس وقت دنیا میں علم کے مخزن دو ہیں - ایک میرا گھرا اور دوسرا ہندوستان - پس آنحضرتؐ کا قول جو کہ "مَا یَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ، إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ" کا مصداق ہے، سب سے بڑی سند اس بات کی ہے کہ ہندوستان اور اس کی قدیم ترین زبان یعنی سنسکرت، سرچشمۂ علوم ہے -

حضور والا! ہم لوگ ہندو دھرم، اپنی مقدس زبان سنسکرت پر اُسی قدر فخر کرتے ہیں، جس قدر آپ اپنی انگریزی پر - اس لیے پاٹھشالا یہ بات چاہتا ہے کہ ہندوؤں کے بچے سنسکرت زبان سیکھیں، ہمارے شاستر پڑھیں اور وید مقدس کے احکام سے واقف ہوں، جو کہ سرتاسر فلسفیانہ اور حکیمانہ ہیں - اپنے مذہب و اخلاق کے اصول سمجھیں تا کہ بے دینی اور بد اخلاقی سے بچ سکیں اور جو تعلیم ہندوستان میں مادیات کی پھیل رہی ہے، اس کے زہریلے اثر سے محفوظ رہیں - پاٹھشالا یہ بات چاہتا ہے کہ ہمارے ہونہار لڑکے پڑھ لکھ کر اپنے مذہب میں مضبوط ہوں، اپنے بزرگوں کے قدم بقدم چلیں اور اُن رشیوں مُنیوں کی سچی اولاد کہلائیں، جنھوں نے علم کی روشنی تمام دنیا میں اُس وقت پھیلائی، جبکہ چاروں طرف جہالت کی ظلمت چھائی ہوئی تھی - ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے لڑکے "دھرم شِکشا" پائیں اور سچی آزادی حاصل کریں اور ویسے ہی "دیش بھگت" بنیں، جیسے یونان و روم کے قدیم باشندے ہوا کرتے تھے -

یورپ فخر کرتا ہے کہ کششِ ارضی کا مسئلہ سر اسحاق نیوٹن نے دریافت کیا تھا،

جو کہ بالاتفاق ۱۶۴۳ء میں پیدا ہوا تھا، مگر یہاں محقق مذکور سے پانسو برس پیشتر، سنہ ۱۱۵۰ء میں ہمارا فاضل بھاسکر اچارج، اس مسئلے کو تفصیل کے ساتھ دلائل و براہین سے ثابت کر چکا تھا۔ اس کی تصنیف "سدھانت شرومنی" لاجواب اور قابل دید کتاب ہے۔ اس نے سب سے پہلے کہا کہ زمین، نہ سانپ کے پھن پر قائم ہے، نہ گائے کے سینگوں پر، نہ کچھوے کی پیٹھ پر، بلکہ ہوا میں معلق ہے اور آفتاب کی کشش سے قائم ہے۔ اسی طرح اُس نے یہ بھی دریافت کیا کہ زمین ہر مادی جسم کثیف کو اپنے مرکز کی طرف کھینچتی ہے۔

تمام دنیا کے ریاضی داں متفق ہیں کہ عرب کے "جبر و مقابلہ" پر ہندوستان کا جبر و مقابلہ فائق ہے۔ اس فن کی ایک شہرۂ آفاق اور مستند کتاب "لیلاوتی" ہے، جو انہی بھاسکر اچارج نے اپنی بیٹی لیلاوتی کے لیے تصنیف کی تھی اور اسی کے نام پر کتاب کا نام رکھا تھا۔ تمام دنیا کے عالم اس کی بڑی قدر و منزلت کرتے ہیں۔ اگرچہ اہل یورپ نے اس علم کو عرب سے حاصل کیا ہے اور اُنھی کی زبان سے مشتق کر کے اِس کا نام "الجبرا" رکھا ہے مگر اس میں شک نہیں کیا جا سکتا ہے کہ عرب، اِس علم کی تہذیب و اصلاح میں ہندوستان سے مستفیض ہوئے ہیں، بنا بریں بالواسطہ یہ علم بھی، یورپ میں ہندوستان ہی سے پہونچا ہے۔

ڈاکٹر ہاروے جس کا شمار متاخرین میں ہے، اُس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ اُس نے دوران خون کے مسئلے کا اکتشاف کیا، مگر علم طب میں ایک کتاب زبان سنسکرت میں "سُشرت" کے نام سے موسوم ہے جس میں دوران خون کا

ذکر موجود ہے اور علمائے یورپ خود اعتراف کرتے ہیں کہ وہ چھ سو برس قبل مسیح تصنیف ہوئی تھی - اس کتاب کا ترجمہ، عربی زبان میں خلیفہ منصور (عباسی) کے عہد میں ہوا - پھر عرب نے اس میں حسب ضرورت اضافے اور ترمیمیں کرلیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ ڈاکٹر ہاروے کی ولادت سے بھی بہت پیشتر مسلمانوں کو بھی، دوران خون کا مسئلہ معلوم ہو چکا تھا -

ان واقعات وحقائق کو جاننے کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ ہندوستان میں علوم کی کمی ہے یا یورپ نے ونیز عرب نے یہاں کے خوان علم سے فیض نہیں پایا - علم ہی پر کیا منحصر ہے، ہندوستان کے ویر، جولانگاہ عمل میں بھی کسی سے پیچھے نہیں رہے - راجاؤں کو لیجیے تو مہاراجا دسرت، راجا جنک اور بکرما جیت کی سلطنت کا سکہ کس کے دل پر بیٹھا ہوا نہیں - سورماؤں کا ذکر کیجیے تو ارجن اور بھیم کی دھاک کون نہیں مانتا - مردوں اور عورتوں میں اخلاق کے نمونے ڈھونڈھیے تو شری رام چندر جی اور مہارانی سیتا دیوی کے کارنامے کافی ہیں یہ تو پرانے زمانے کا ذکر ہے - آئیے آخری دور پر بھی ایک نظر ڈالیں - مُردوں میں مہاتما تلک، گوکھلے اور سر سید وغیرہ اور زندوں میں مہاتما گاندھی اور علی برادران، آج بھی ایسی ہستیاں ہیں جن پر ہندوستان قیامت تک ناز کرے گا -

حضور والا! میں کہاں سے کہاں جا پہونچا، جس سے آپ کی بہت سمع خراشی ہوئی اس کی معافی چاہتا ہوں - ایک بار آپ کی زحمت کا شکریہ پھر ادا کرتا ہوں

موسیقی کانفرنس کا پہلا اجلاس

بھارتی پاٹھشالا کی نمائش کے سلسلے میں بتاریخ ۲۲، ۲۳ جنوری ۳۳ء
بمقام پلرا پارک، ایک موسیقی کانفرنس منعقد ہوئی - مشران صاحب نے
ماسٹر شبن لال سکریٹری کانفرنس کی درخواست پر جلسے کی صدارت فرمائی
اور حسب ذیل افتتاحیہ تقریر کی:-

حضرات انجمن! مجھے سب سے پہلے ارکان کمیٹی کا شکریہ ادا کرنا چاہیے، جنھوں نے مجھے اس کانفرنس کی صدارت پر ممتاز فرما کر میری عزت افزائی فرمائی ہے، جس کے لائق میں اپنے آپ کو کسی طرح نہیں سمجھتا، کیونکہ میں فن موسیقی کا مذاق سلیم اور وجدان صحیح نہیں رکھتا - جو کچھ اس وقت عرض کروں گا وہ بے وقت کا راگ ہوگا -

صاحبان والاشان! آج سامعین کی جماعت تھوڑی ہے - لیکن اس کی وجہ یہ نہیں کہ موسیقی جیسے فن شریف سے یہاں کے لوگ دلچسپی نہیں رکھتے بلکہ اصلی سبب یہ ہے کہ اس وقت ساون کی ایسی گھنگھور گھٹا چاروں طرف چھائی ہوئی ہے، گویا ظلمات کی کیفیت نظر آ رہی ہے - گھٹا ٹوپ اندھیرا ہے - چوطرفہ بادل فیل بے زنجیر کی طرح جھومتے جھامتے چل رہے ہیں - بجلی کی کڑک اور رعد کی گرج سن سن کر دل دہل رہے ہیں - کالے کوسوں تک فضا تیرہ و تار ہے سے

ابر بھی چل نہیں سکتا یہ اندھیر اگھُپ ہے　　برق سے رعد یہ کہتا ہے کہ لانا مشعل
جس طرف سے گئی بجلی پھر اُدھر آ نہ سکی　　قلعۂ چرخ میں ہے بھول بھلیاں بادل
کبھی ڈوبی، کبھی اُچھلی، مہ نو کی کشتی　　بحرِ اخضر میں تلاطم سے پڑی ہے ہلچل
ابر، پنجابِ تلاطم میں ہے اعلیٰ ناظم　　برق، بنگالۂ ظلمت میں گورنر جنرل

گو کہ آسمان موسیقی و ترنم ریزی سے محظوظ ہونے کا مقتضی ہے مگر برق و باراں کی تبسم خیزی اور اشک ریزی کو دیکھ کر یہ توقع پہلے ہی سے نہ تھی کہ آج لوگ گھروں سے باہر نکل سکیں گے۔

حضرات! ہم سب کو بھارتی پاٹھشالا کے منتظموں اور کارکنوں کا دلی شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ اُنھوں نے اس کانفرنس کے ذریعہ چاہا ہے کہ فن موسیقی کو اس شہر میں عام طور پر رواج دیں، جو ہمارے پرانے رشیوں کا نہایت دل پسند فن تھا۔ وہ رشی جنھوں نے اس علم و فن میں کمال حاصل کیا اور چہار دانگ عالم میں جگت گرو کہلائے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اگرچہ آج ہر ملک اور ہر قوم کی زبان کے موافق راگ راگنیوں اور پردوں اور تانوں کے نام جدا گانہ رکھ لیے گئے ہیں، مگر وہ سب ہندوستان ہی کے سرچشمۂ علوم و فنون سے نکلتے ہیں۔

تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ بیجاپور میں اس علم و فن کی قدردانی بہت زیادہ تھی۔ وہاں کے بادشاہ ابراہیم عادل شاہ اور برہان نظام شاہ، اس علم بدیع اور فن لطیف میں کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ ظہوری جو پایۂ تخت کا شاعر تھا، اُن کی شان میں کہتا ہے کہ "علم موسیقی را اصل و جملہ را فرع می دانند" یعنی ہمارے بادشاہ کا قول ہے کہ علم موسیقی تمام علوم کی جڑ ہے اور تمام علوم،

موسیقی کی شاخیں ہیں۔

صاحبو! ہم لوگ یہ چاہتے ہیں کہ ایسی کانفرنسوں کے ذریعہ، اس شہر کے لوگوں کے دلوں میں شوق پیدا کریں کہ وہ اس فن لطیف سے واقف ہوں اور اس سے پورا لطف حاصل کریں: جس کو قدردانوں اور ماہروں نے غذائے روح کہا ہے۔ ہم یہ بات چاہتے ہیں کہ علم و فن موسیقی کو طلبہ کی تعلیم و تربیت کا ایک جزو بنا دیں، تاکہ جس طرح وہ اور علوم و فنون سیکھتے ہیں، اسی طرح وہ تعلیمی کورس کے ساتھ علم موسیقی بھی سیکھ جائیں، ہماری خواہش ہے کہ اس فن کو ان کے کورس کا جُزو لاینفک بنا دیں، تاکہ ان کے دلوں میں اس سے حظ روحانی اور کیف دوامی حاصل ہو۔

واضح ہو کہ علم و فن موسیقی کی ابتدا بلکہ ایجاد شری مہادیو جی سے ہوئی، جس سے غرض یہ تھی کہ عبادت الٰہی کے لیے بکار آمد ہو اور سب اس میں جی لگا کر شرکت کریں۔ عرب و عجم میں قرآن مجید بھی خوش گلوئی کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔ بلالِ حبشی جو کہ رسول مقبول صلعم کے موذنِ خاص تھے، ان کی اذان میں اتنی موسیقیت تھی کہ مسلمانوں کے علاوہ، کفار عرب بھی سُن کر محظوظ ہوتے تھے۔ میں نے انعقاد جلسہ سے پیشتر اسی بزم میں ابھی بنے خاں کو بھی سنا، جنھوں نے بڑی سریلی دھن میں کلام پاک کی چند آیتیں پڑھ کر سنائیں، جن کو سُن کر حظ روحانی حاصل ہوا اور راگ راگنی کا مزہ آگیا۔ یہ اور بات ہے کہ ملک و قوم و زبان کے لحاظ سے اکثر راگ راگنیوں اور باجوں کے نام ہندوستان و عرب و ایران میں بدل گئے ہیں۔ مثلاً ہندوستان میں ایک راگنی کا نام

جنگلا ہے - اس کا نام ایران میں "زنگلہ" ہے، اسی طرح باجوں کے ہندوستانی ناموں کو ترمیم کر کے، اپنے اپنے مذاق قومی کے موافق بنا لیا گیا ہے - کسی میں دو تونبیاں لگا دیں، کسی کو بجائے مضراب کے کمانچے سے بجایا اور اس کی صورت اول میں کچھ تاروں کا اضافہ کر لیا -

واضح ہو کہ ہمارے یہاں چھ راگ ہیں، یعنی مالکوس، سری راگ، میگھ راگ، دیپک راگ، ہنڈول راگ، اور بھیرویں راگ، ہر ایک میں پانچ پانچ راگنیاں ہوتی ہیں، اس طرح کل تیس راگنیاں ہوتی ہیں - ان راگنیوں کی شاخیں بیشمار ہیں - اکثر دو راگنیوں کا اشتراک کر دیا جاتا ہے مثلاً رات کے دو بجے دیس اور سوہنی ملا دیتے ہیں - یہ سب علمی اصول ہیں جن کے قواعد وضوابط شیام وید میں درج ہیں اور وہی وید مقدس اس علم و فن کا سرچشمہ ہے - شیام وید اکثر گا کر پڑھا جاتا ہے - راگ راگنیوں کے الگ الگ اوقات مقرر ہیں - بارہ بجے رات سے بارہ بجے دن تک راگنیاں بہت زیادہ سہانی ہوتی ہیں - بارہ بجے شب کو بھاگ کا وقت ہے - دیس اور سوہنی ایک بجے شب سے دو بجے تک موزوں ہے - برج ۳ بجے صبح دلکش ہوتا ہے - بھیرویں کا سہانا راگ، صبح سے آٹھ بجے تک جس وقت چھیڑ دیا جائے، دلوں کو بےچین کر دے - سارنگ دس بجے سے گیارہ بجے تک گایا جائے تو سننے والا محو ہو کر رہ جائے - گوری راگ چار بجے شام کو اور شیام کلیان راگ پانچ بجے سے چراغ جلے تک الاپا جائے تو دل تڑپ اٹھے - اسی طرح عرب و عجم میں ان تمام راگوں کے نام اور اوقات مقرر ہیں -

صاحبو! امام فخرالدین رازی کا قول ہے کہ موسیقی کی ایجاد حکیم فیثاغورث یونانی نے کی، جو حضرت سلیمان کا شاگرد تھا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ حضرت داؤد سے موسیقی کا ایجاد ہوا۔ یہ ویسی ہی بات ہے، جیسے کہ یہ کہا جاتا ہے کہ روضۂ تاج گنج اٹلی کے کاریگروں کا بنایا ہوا ہے۔ یہ مانا کہ لحن داؤدی مشہور ہے اور جب وقت حضرت داؤد گاتے تھے تو ہوا کے پرندے اُتر آتے تھے اور وجد کی حالت میں نغمہ سُنا کرتے تھے، بلکہ یہاں تک کہا جاتا ہے کہ اُن کی آواز سے لوہا نرم ہو جاتا تھا۔ اسی طرح ہندوستان کے اکثر مطربوں کے نغمے کی تاثیرات مشہور ہیں کہ کسی نے ملار گائی اور بادل آگیا اور پانی برسنے لگا۔ ہمارے سری کرشن جی مہاراج کی نسبت تو سبھی جانتے ہیں کہ آٹھ دس برس کی عمر میں جب بانسری بجاتے تھے، تو گرد و پیش کے گوالے اور اُن کی عورتیں اور بچے سب گھروں سے نکل آتے تھے اور وجد کی حالت میں بانسری سنا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ گائیں جن کو چرانے کے لیے سری کرشن جی مہاراج لے جاتے تھے، وہ بانسری کا نغمہ سننے کے لیے آکر گرد و پیش کھڑی ہو جاتی تھیں مطلب یہ ہے کہ خوش آوازی اور ماہریت اور بات ہے اور موجد اور مُخترع ہونا دوسری بات ہے۔ بعض کا قول ہے کہ قُقنس ایک پرند ہے، اس کی آواز سے حکیموں نے موسیقی کا استخراج کیا ہے۔ قُقنس کا حال سُن کر آپ کو مزید دلچسپی ہوگی اور اس سے ہمارے یہاں کے راگ کی عظمت آپ کو معلوم ہو جائے گی۔ قُقنس کا جوڑا نہیں ہوتا۔ اُس کی نسل چلنے کا عجیب ماجرا ہے۔ اُس کی منقار میں تین سو ساٹھ سوراخ

ہوتے ہیں، جن سے رنگا رنگ آوازیں نکلتی ہیں - جب وہ بوڑھا ہوتا ہے تو لکڑیاں اور تنکے وغیرہ جمع کرکے اُن پر بیٹھتا ہے اور دیپک راگ گاتا ہے، اُس سے آگ لگ جاتی ہے اور وہ جل کر خاکستر ہو جاتا ہے - پھر قدرت الٰہی سے اُس خاکستر پر جب پانی برستا ہے تو اُس راکھ میں انڈا پیدا ہو جاتا ہے - جس سے قُقنس کی نسل قائم رہتی ہے - بعض کا قول ہے کہ دیپک راگ نہیں گاتا بلکہ اپنے بال و پر پھڑپھڑاتا ہے - اِس ہوائے گرم سے آگ پیدا ہو جاتی ہے اور وہ جل کر راکھ ہو جاتا ہے - اس پرند کا ذکر ایران و عرب کے لٹریچر میں بھی موجود ہے اور وہ لوگ اس کو موسیقار کہتے ہیں - لفظ موسیقی اسی کے نام سے مشتق ہے -

صاحبان ذیشان! جس طرح ہمارے یہاں سات پردے ہیں یا سات سُر ہیں، اسی طرح عرب و عجم میں بارہ پردے اور سُر ہیں - ہمارے یہاں سُروں کے نام، سا[1]، رکھب[2]، گندھار[3]، مدھم[4]، پنچم[5]، دھیوت[6]، اور نکھاد[7] ہیں - عرب و عجم میں ان کو راہاوی[1]، حسینی[2]، راست[3]، حجاز[4]، بزرگ[5]، کوچک[6]، عراق[7]، صفاہان[8]، نوا[9]، عشاق[10]، اتکلہ[11] اور بوسلیک[12] کہتے ہیں - اسی طرح ہمارے یہاں باجوں کے نام ہیں ستار، سارنگی، سنگھار، بیلا، بانسری، جل ترنگ، نس ترنگ، الغوزہ وغیرہ، ویسے ہی عرب و عجم میں بھی ہیں عود، بربط، دلربا، طاؤس، سرود، زود، ارغنون سرآیبہ، چنگ، رباب، سراچہ، اسرار وغیرہ - ان میں جو باجے کمانچے سے بجائے جاتے ہیں وہ زیادہ سریلی آواز دیتے ہیں - مثلاً

سارنگی ، سرسنگھار وغیرہ -

حضرات ! اس وقت ، بارش کے خوشگوار مناظر اور سامعین کی قلت،
دونوں باتیں اس کی مقتضی ہیں کہ میں اب اپنی تقریر کو جو بے وقت کی
بھیرویں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی ہے ، دوسرے وقت کے لیے
ملتوی کروں تاکہ میں اور آپ راگ اور راگنیوں کی دلکش آوازوں سے
لذت اندوز ہوں اور موسم کا لطف اُٹھائیں -

موسیقی کانفرنس کا دوسرا اجلاس

بتاریخ ۲۳، جنوری ۱۹۳۳ء بوقت ۹ بجے شب، مشران صاحب نے پھر صدارت کی اور حسب ذیل افتتاحی تقریر فرمائی :-

میرے بھائیو اور دوستو! اس وقت مجھے پھر آپ نے صدارت کی عزت عطا فرما کر میرا پایۂ افتخار بلند کر دیا ہے۔ میں مکرر آپ صاحبوں کا شکریہ دلی ادا کرتا ہوں۔ اس بزم نشاط اور محفل سرور کے لیے پلزا پارک جیسا دلکش مقام نہایت زیبا ہے، کیونکہ پلزا پارک، آج کل نمائش کے سامانوں اور رنگا رنگ پھولوں اور سبزہ زار سے ایک گلزار پر بہار بنا ہوا ہے۔ جدھر دیکھیے چمن زار نظر آتے ہیں ؎

وہ بہار آئی نواسنج ہیں مرغانِ چمن ۔۔۔ غیرتِ باغِ ارم آج ہے صحنِ گلشن
جوش میں زمزمہ سنجی پہ ہیں مرغانِ بہار ۔۔۔ کیا تعجب ہے کہ گویا ہو زبانِ سوسن
کرم ابر بہاری سے ہے سیراب زمیں ۔۔۔ خاک اُڑ کر نہیں ہوتی ہے غبارِ دامن
چھیڑتی ہے جو صبا تارِ رگِ گل پیہم ۔۔۔ تال دیتا ہے کفِ برگ سے ہر نخلِ چمن
آب شبنم سے کہاں کاسۂ گل ہیں لبریز ۔۔۔ جل ترنگ آج بجانے کو ہے معشوق چمن

صاحبو! دنیا میں دو چیزیں ایسی ہیں جو انسان کے دل کو بزور اپنی طرف کھینچتی ہیں۔ ایک حسنِ صورت اور دوسرے حسنِ صوت۔ لیکن

دونوں کے دیکھنے اور سننے سے دو مختلف قسم کے جذبات دلوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ اگر کوئی پری پیکر گل اندام عورت جو آہو چشم اور غزالہ مشکیں ہو اور وہ ہمارے سامنے آجائے تو ہم کو اس کے نظارے میں حظ نفسانی حاصل ہوگا، یعنی نفسانی جذبات برانگیختہ ہوں گے۔ لیکن کوئی گانے والا اگر لحنِ داؤدی میں ہم کو گانا سنائے تو ہمارے دل میں جو جذبات پیدا ہوں گے وہ پاکیزہ اور بے لوث ہوں گے۔ یعنی ہم کو حظّ روحانی حاصل ہوگا۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ ؎

بہ از روئے زیبا ست آواز خوش　　　　کہ آں حظ نفس ست وایں قوتِ روح

ظاہر ہے کہ خوش آوازی کے ساتھ گانا غذائے روح ہے۔ اب فرض کیجیے کہ اسی گل اندام عورت میں، جس کے حسنِ گلو سوز کا ذکر کر چکا ہوں، اعلیٰ درجے کی خوش آوازی کا وصف بھی ہو، گانے بجانے کے اصول و قواعد سے بھی وہ ماہر ہو، اس پر طرّہ یہ ہو کہ رقص میں بھی وہ کامل ہو، جو خصوصاً عورت کی ذات میں ہونا نہایت تقویٰ شکن ہے، تو دیکھنے اور سننے والوں کا حال کیا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ وہ پرکالۂ آتش قتالۂ عالم سمجھی جائے گی۔ لوگ اُس کے ناچنے پر مر مر جائیں گے اور تڑپ تڑپ جائیں گے۔ فرشتے بھی اپنی فرشتہ خصلتی پر قائم نہیں رہ سکتے۔ زاہد و عابد صد سالہ مرتاض وصوفی سب زہد و تقویٰ بھول کر اُس کے عشق میں بیخود ہو جائیں گے۔ ہماری رامائین میں اس کی مثال موجود ہے۔ یعنی یہ کہ مہاراجا دسرت نے اپنے دربار کی ایک اپسرا کو شنگی رکھ کے لانے کے لیے جنگل میں بھیجا۔

وہ اُپسرا حُسن و جمال میں بے مثل ہونے کے علاوہ گانے اور ناچنے میں بھی بے نظیر تھی، چنانچہ شنگی رکھ پر موسیقی کا جادو کر کے دربار میں لے آئی۔ منشی شنکر دیال فرحت نے جو ہندوؤں کے مذہبی شاعر بے نظیر ہیں اس موقع کو رامائن میں نہایت خوبی سے نظم کیا ہے۔ آپ کی تفریح طبع کے لیے دو چار شعر سناتا ہوں۔ کہتے ہیں۔

گئی بن میں وہ محبوبِ زمانہ
زباں پر تھا تکلم پُر ترانہ

لباسِ پُر تکلف تن میں پہنے
تن گلرنگ میں پھولوں کے گہنے

بہار آسا رخ گلگوں پہ آنچل
کمر میں بار گیسو سے پڑے بل

غرض گت ناچتی آئی جو بن میں
بہار آئی ہر اک نخل کہن میں

پڑی گوش جہاشن میں جو آواز
تو دل نے سوز الفت سے کیا ساز

دیے گیسو کی صورت دل کو جھٹکے
دکھایا اُس نے رُخ آنچل پلٹ کے

یہ بھولے اپنی درویشی کا لٹکا
تصور بندھ گیا ناگن سی لٹ کا

صاحبو! واضح ہو کہ تمام راگ راگنیوں اور سُروں، پردوں اور باجوں کا سرچشمہ انسان کا گلا ہے۔ کوئی ماہر گانے والا خوش آواز ہو تو اس کا گانا سننے میں جو مزہ آئے گا وہ کسی باجے کی آواز میں نہیں آ سکتا۔ اگر کوئی شخص گانے میں ماہر ہو مگر باجا نہ بجاتا ہو، وہ ہر باجا شاگرد کو سکھا سکتا ہے اور اُس کے شاگرد باجا بجانے میں ماہر ہو سکتے ہیں۔ یہاں ایک شخص عوض خاں تھے وہ صرف گانا جانتے تھے اور کوئی باجا بجانے کی مہارت ان کو نہ تھی۔ لیکن ان کے شاگرد سارنگی اور ستار وغیرہ

بجانے میں بہت معروف و مشہور ہوئے - ایک ستار باز کو میں نے
خود دیکھا اور سنا - جس وقت وہ مشق کرتا تھا، ستار میں سے دھواں اُڑتا
معلوم ہوتا تھا - بالفرض گانے کا ماہر اندھا بھی ہو وہ بھی شاگرد کا ہاتھ
باجے پر ٹھیک پردے پر رکھوا دے گا - کیونکہ جب تک شاگرد ٹھیک
پردے پہ انگلی نہ رکھے گا استاد غلطی بتاتا جائے گا، کیونکہ اُس کے کان
سروں سے پورے آشنا ہیں - ماہروں کا قول ہے کہ محض گانا بغیر مزامیر
(یعنی باجوں) کے بے لطف ہے - گانے کے ساتھ طبلے کی تھاپ، بائیں
کی کمک، مجیروں اور گھونگرؤوں کی جھنکار ضرور ہونا چاہیے اور کوئی باجا
مثل سارنگی یا ہارمونیم، سرسنگھار وغیرہ کے ہونا چاہیے، ورنہ گانے کا
لطف ادھورا رہ جائے گا، گانے والے کا بھی جی نہ لگے گا اور سننے والوں
کا بھی مزہ بگڑ جائے گا - گانے کے ساتھ باجے ہوں تو بعض وقت لے
بندھ جاتی ہے اور اُس وقت لطف بہت بڑھ جاتا ہے -

صاحبو! ہمارے ملک میں ماہروں کا قاعدہ ہے کہ کوئی راگ راگنی
بے وقت نہ گاتے ہیں، نہ بجاتے ہیں - تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ
یہ رواج عرب و عجم میں بھی کسی نہ کسی صورت میں رہا - ہمارے ملک میں
اگر کسی سے بے وقت راگ یا راگنی گانے یا بجانے کی فرمائش کی جائے
تو وہ بیسیوں بہانے اور عذر کرے گا اور پیشہ ور تو ہرگز ہرگز نہ بے وقت
گائے گا، نہ بجائے گا - اگرچہ اُس کو اپنی روزی جانے کا اندیشہ ہو -
اعتقاد یہ ہے کہ جو راگنی گائی یا بجائی جاتی ہے وہ سامنے آکر کھڑی ہو جاتی

ہے اور بے وقت طلبی سے اپنی توہین سمجھتی ہے - اس کی مثال یہ ہے کہ کسی معزز شخص کو ہم بے وقت اپنے پاس بلائیں تو وہ ہم سے کیا خوش ہوگا؟ اگر مجبوری سے وہ آ بھی جائے تو اپنی ہتک سمجھے گا - ماہرین کا خیال ہے کہ راگنیوں کو بھی نقصان پہونچتا ہے اور گانے بجانے والوں کو بھی - کسی کا گلا بیٹھ جاتا ہے، کسی کا ہاتھ بیکار ہو جاتا ہے - اس کے علاوہ ایک بات یہ ہے کہ بے وقت راگ راگنی گانے، بجانے سے سننے والوں کو بھی مزہ نہیں آتا اور گانے بجانے والے کا جی بھی نہیں لگتا - فرض کیجیے کہ اس وقت جبکہ رات کے نَو بجے ہیں اگر کوئی بھیرویں گائے یا بجائے تو سب کے نزدیک ایک بھونڈی بات ہو گی اور سب حاضرین کی طبیعت مکدر ہو جائے گی - پس اگر بدرجۂ مجبوری ایسی غلطی کسی سے سرزد ہو جائے تو وہی بات ہوگی کہ ؎

سحر کی بھیرویں کو شیام کلیاں اس جگہ سمجھو　　کدارا چاندنی میں ہے اندھیری رات کا بانی

تب ہی مثل مشہور ہوئی ہے کہ "بے وقت کا راگ، یا وقت کا راگ"۔

صاحبو! آج کل ہم نے معمولی گویّوں سے غزلوں اور دادروں کی فرمائش کرکرکے اعلیٰ درجے کے پکّے گانے کی قدر و منزلت گھٹا رکھی ہے - چونکہ غزلوں اور دادروں کے گانے میں سیدھی سیدھی تانیں ہوتی ہیں، لہٰذا ناواقفوں کو اُن کے سننے میں مزہ آتا ہے - گلی کوچوں میں اکثر لڑکے، غزلیں گاتے ہوئے پھرا کرتے ہیں - اگر وہ خوش آواز ہیں تو اناڑیوں کو بھی سننے میں

لطف آتا ہے۔ رفتہ رفتہ رواج ایسا ہوگیا ہے کہ معمولی رقص و سرود کی محفلوں میں عوام کو خوش کرنے کے لیے مُغنیہ عورتیں غزلیں اور دادرے زیادہ گایا کرتی ہیں اور ٹھمری وغیرہ کمتر، لیکن کوئی جاننے والا کسی واقف کار مغنّی سے سوائے ٹھمری، پٹا، دھرپد اور اعلیٰ درجے کے راگ راگنیوں کے دوسری فرمائش نہ کرے گا، کیونکہ وہ یہ سمجھے گا کہ غزل یا دادرے کی فرمائش کرنا، جن میں راگ راگنیوں کے اُتار چڑھاؤ کچھ نہیں ہوتے، اپنی اور گانے والے دونوں کی حقارت کرنا ہے۔

صاحبو! علم و فن موسیقی کے ماہروں کی قدر و منزلت راجاؤں اور مہاراجاؤں اور والیان ملک کے درباروں میں زمانہ قدیم سے دیکھی جاتی ہے۔ یہ لوگ درباروں کی زیب و زینت ہمیشہ سمجھے گئے۔ بادہ و جام کی طرح اس جماعت (مغنیاں) کا لقب "غم غلط" پڑ گیا ہے۔ ہمارے ملک میں زمانۂ حال میں دو چار موسیقی داں مشہور و معروف گزرے ہیں۔ تان سین اور بیجو ریاست گوالیار میں بڑے نامی گرامی گانے اور بجانے والے تھے۔ کل کی بات ہے کہ لکھنؤ کے بندا کالکا علم و فن موسیقی کے بے نظیر ماہر گزرے، جن کا جواب سارے ایشیا میں نہ تھا۔ جس شاگرد نے اُن کے سامنے چھ مہینے بھی زانوئے ادب تہ کیا وہ اپنے وطن میں ناموری اور شہرت کی دولت ساتھ لایا۔ میری دیکھی ہوئی بات ہے کہ جمنا رام جنی یہاں کی ایک طوائف نے چند روز (شاید زیادہ سے زیادہ چھ مہینے) بندا کالکا کی شاگردی کا فخر حاصل کیا۔ واپس آتے ہی یہاں اُس کا پہلے سے

ناشہرہ ہوگیا اور کوئی محفل ایسی نہیں ہوتی تھی جہاں وہ خاص طور پر
ئی نہ جاتی ہو۔ خصوصاً اُس کا ناچنا ایسا تھا کہ ؎

رقص میں کشتہ تھا عالم اُس بُتِ خونخوار کا ہر قدم کا بڑھ کے پڑنا ہاتھ تھا تلوار کا

ہندوستان میں بندا کالکا کا وہی درجہ تھا جو خسرو پرویز بادشاہ عجم کے دربار میں بار بد و نگیسا کا یا عرب میں ہارون اور مامون خلفائے عباسیہ کے دربار میں اسحاق موصلی اور ابراہیم کا۔ اسحاق کا مشاہرہ دس ہزار درم ماہانہ تھا۔ جو سکۂ حالی کے حساب سے ڈھائی ہزار روپیے کے برابر ہے۔ اس کو دربار ہارون میں ندیموں کے زمرے میں جگہ دی جاتی تھی اور دربار میں فقہاء کا لباس پہن کر آنے کی اجازت تھی، جس سے اُس کا اعزاز خاص ظاہر ہوتا ہے۔ یہ شخص علاوہ موسیقی کے فقہ، نحو، انساب و روایات میں مجتہدانہ کمال رکھتا تھا اور علم و فن موسیقی میں اُس کی ایجادات و اختراعات کی بدولت اُس کو وہی مرتبہ دیا گیا ہے جو حکیم فیثاغورث کو فلسفۂ یونانی میں حاصل تھا۔ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ خلفائے بنو اُمیہ و عباسیہ میں یک بھی خلیفہ ایسا نہیں گزرا جو اس علم بدیع اور فن شریف میں اچھی دستگاہ رکھتا ہو۔ بڑے بڑے مذہبی علماء اس چسکے سے خالی نہ تھے۔

صاحبو! میں آپ کی خدمت میں اسحاق کی ماہریت کے واقعات ظاہر کروں جو تاریخ عرب سے معلوم ہوتے ہیں۔ دربار ہارون میں سائی کنیزیں بزم عیش و طرب میں شریک ہوتی تھیں، جو گلے میں سونے کی صلیبیں لٹکائے، کمر میں سونے کے زنار پہنے، ہاتھوں میں گلدستے

لیے ہوئے محفل نشاط میں اپنے جلوے دکھایا کرتی تھیں ۔ یہ کنیزیں نہایت پری پیکر و گل اندام ، اعلیٰ درجے کی خوش آواز ، گانے بجانے میں ماہر ، خوشنویسی ، حاضر جوابی ، لطیفہ گوئی ، بذلہ سنجی میں بے نظیر تھیں اور ایک ایک لاکھ درہم کی قیمت پر خریدی گئی تھیں ۔ ایک روز ایسی بیس کنیزیں جو دیبائے رومی کے قیمتی لباس زیب تن کیے ہوئے تھیں ، عود ، اور بربط بجا رہی تھیں ۔ اتفاقاً اسحاق آیا ، اُس نے کہا کہ ان میں سے ایک کی مضراب تار پر غلط پڑ رہی ہے ۔ پھر ذرا غور کے بعد کہنے لگا کہ فلاں صف سے غلط آواز آ رہی ہے ۔ ذرا دیر بعد بولا کہ سب کنیزیں بجانا بند کریں صرف فلاں کنیز بجائے ۔ جب اُس کنیز نے باجا بجایا اُس کی غلطی ظاہر کردی ۔ اس پر تمام محفل دنگ رہ گئی ۔ اُس شخص کا کمال دیکھنا چاہیے کہ اسّی تاروں میں ایک تار پر مضراب غلط پڑ رہی تھی جو اُس کے کان میں کھٹک گئی ۔ باوجود اس ماہریت کے وہ ایک کنیز غریب نامی کا شاگرد تھا ، جس نے ایک ہزار راگنیاں ایجاد کی تھیں ۔ اُس کنیز کی کاملیت کا اندازہ کرنا چاہیے ، جس کی شاگردی کا فخر اسحاق ایسے استاد کامل کو تھا ۔ اسحاق کی خوش آوازی اور لحن داؤدی کا اندازہ یوں کرنا چاہیے کہ ہارون کا قول تھا کہ جب اسحاق گاتا ہے تو مجھے ایسا سرور موفور ہوتا ہے ، گویا میری سلطنت میں کوئی ملک مفتوحہ اضافہ ہوگیا ہے ۔ ظاہر ہے کہ بادشاہوں کو ملک فتح کرنے پر جو خوشی ہوتی ہے وہ کسی دوسری بات سے نہیں ہوتی

پس دیکھنا چاہیے کہ اُس خوشی کا درجہ کتنا بڑھا ہوا تھا، جو ہارون کو اسحاق کے گانے سے ہوتی تھی۔ غریب کنیز کی سوانح عمری اور موسیقی دانی میں ایک مستقل کتاب خلیفہ معتز باللہ نے لکھی ہے۔ دو کنیزیں ایسی ہی کامل اور ماہر تھیں اور ایک کا نام بذل اور دوسری کا نام زلزل تھا، جن کا تذکرہ کتب تاریخ میں بہت بسط کے ساتھ کیا گیا ہے۔ یہ دونوں مامون رشید کے شبستان عیش کی زیب و زینت تھیں۔

حضرات! رقص و سرود کی کیا تعریف کی جائے جبکہ اس کا ذکر بھی اتنا وجد انگیز اور دلکش ہے کہ میں عالم محویت میں کہاں سے کہاں جا پہونچا۔ ع

یہ بھی خبر نہیں کہ کہاں تھا، کہاں ہوں میں

اب آپ ماہرین فن کا گانا بجانا سنیے اور وقت کے راگ راگنیوں کا لطف اٹھائیے۔